ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

محرم سنہ ۶۱ھ (مطابق فروری سنہ ۴۲ء) جلد ۲۰ عدد ۱

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس
سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن، پونچھ روڈ،
مبارک پارک، لاہور سے
شائع ہوا۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس اشاعت سے ان صفحات میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا ایک سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ ترجمہ جس نوعیت کا ہے اس کے لحاظ سے اسے ترجمہ کہنے کے بجائے ترجمانی کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں، اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مبین میں جو کلام نازل ہوا ہے اس کی ترجمانی جہاں تک ممکن ہے اردو ئے مبین میں ہو، اصل کلام کا فطری ربط آپ سے آپ ترجمہ میں نمایاں ہونا چاہئے، اور کلام الٰہی کے شاہانہ وقار، زور بیان، اور موقع و محل کے مطابق بدلتے ہوئے لہجے اور اسلوب کو بھی جہاں تک بس چلے اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان اغراض کے لیے لفظی ترجمہ کی پابندیوں سے نکلنا بہر حال ناگزیر تھا، اس لیے میں نے ترجمہ کے بجائے ترجمانی کا ڈھنگ اختیار کیا، البتہ انتہائی ممکن احتیاط کے ساتھ میں نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ اصل عبارت کے الفاظ جس قدر مفہوم کے محتمل ہوں اس سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ پھر مجرد ترجمانی سے ایک عام ناظر کے فہم قرآن میں جو کمی باقی رہ جاتی ہے اُسے پورا کرنے کے لیے میں نے مختصر تفسیری حواشی اور ہر سورت کے آغاز میں ایک مختصر مقدمہ کا اضافہ کیا ہے، اور ان میں ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ آدمی کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر صرف وہ باتیں بیان کر دی ہیں جن کا جاننا قرآن کے معنی و مدعا کو اچھی طرح سمجھنے

کے لیے ضروری ہے۔ اسی مناسبت سے میں نے اس کا نام "تفہیم القرآن" رکھا ہے کیونکہ اس سلسلہ کو شروع کرنے سے میرا مقصد عام لوگوں کو قرآن سمجھانا ہے۔

قرآن کے بارے میں کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ اس کے پورے علم پر حاوی ہوگیا ہے، پھر بھلا مجھ جیسے ایک قلیل البضاعت شخص کے لیے یہ کس طرح جائز ہوسکتا ہے کہ وہ تنہا اپنے بل بوتے پر اس کتاب عظیم کی ترجمانی کرکے اسے ایک مختتم چیز کی حیثیت سے دنیا کے آگے پیش کردے۔ اس لیے میں کتابی صورت میں اس کی اشاعت سے پہلے تنقید و مشورہ کے لیے اسے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ رسالہ میں اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کرنے سے میری غرض یہی ہے کہ اہل علم و نظر حضرات بالخصوص اور عام ناظرین بالعموم اسے تنقیدی نظر سے ملاحظہ کریں اور جہاں کوئی غلطی یا فروگذاشت، یا ترجمانی و تفسیر میں کوئی تشنگی، یا کسی اعتراض و شبہ کی گنجائش پائیں ازراہ کرم مجھے اس پر متنبہ فرمادیں تاکہ نظر ثانی کے وقت میں ان کے مشوروں سے استفادہ کرکے اس چیز کو زیادہ سے زیادہ صحیح و معتبر اور مفید بنا سکوں۔ سردست اس سلسلہ کو آخری تیار شدہ چیز نہ سمجھا جائے بلکہ محض ایک مسودہ کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ برادران دینی سے میری درخواست ہے کہ وہ اس خدمت کی تکمیل میں میری مدد فرمائیں۔ جو اصحاب بھی اس میں میری اعانت کریں گے میں ان کا شکرگزار ہوں گا اور اگر کچھ لوگ ہمدردانہ مشورہ و اصلاح کی جگہ طعن و تعریض کا طریقہ اختیار کرنا پسند فرمائیں تو ان کے ارشادات میں بھی جہاں کوئی بجا اعتراض دیکھوں گا اس سے استفادہ کرنے اور ان کی عنایت کا شکریہ ادا کرنے میں انشاءاللہ مجھے تامل نہ ہوگا۔

جہاں تک ترجمۂ قرآن کا تعلق ہے، یہ خدمت بہترین طریقہ پر اس سے پہلے متعدد بزرگ انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت بظاہر نظر نہیں آتی۔ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور اردو میں شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب، مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور بعض دوسرے حضرات کے تراجم اس غرض کے لیے بالکل کافی ہیں کہ ایک شخص ان کے

ذریعہ سے کلام اللہ کا لفظی مفہوم ٹھیک معلوم کرلے۔

یہ ترجمے بجائے خود اپنا ایک فائدہ، اور عظیم فائدہ رکھتے ہیں۔ پابندیٔ الفاظ کے ساتھ صحیح ترجمہ کی ضرورت بہرحال ہے اور باقی رہے گی۔ اس سے جو فائدہ وابستہ ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس ترجمانی سے میرا یہ مدعا بھی نہیں ہے کہ لوگوں کو لفظی ترجموں سے بے نیاز کردیا جائے حتیٰ کہ ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

دراصل جو کچھ میرے پیش نظر ہے وہ صرف یہ ہے کہ فہم قرآن کے سلسلہ میں بعض اہم ضرورتیں جو لفظی ترجموں سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہوسکتیں انھیں اس ترجمانی کے ذریعہ سے پورا کیا جائے۔ الفاظ کی پابندی کے ساتھ جو ترجمے کیے گئے ہیں ان کا اصل فائدہ یہ ہے کہ ناظر کو ہر آیت کے مقابلہ میں اس کے لفظ لفظ کا مفہوم معلوم ہوجاتا ہے اور کم و بیش آیت کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے، لیکن اس فائدہ کے ساتھ چند پہلو نقصان کے بھی ہیں جن کی کسر پوری کرنا پابندیٔ الفاظ کے ساتھ ممکن نہیں ہے اور اس غرض کے لیے بہرحال ایک دوسری نوعیت کی کوشش ناگزیر ہے۔

سب سے پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمہ کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیٔ عبارت، زورِ بیان، بلاغت زبان اور تاثیرِ کلام کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ترجمہ پڑھنے اور سننے والے کی روح کبھی وجد میں نہیں آتی، اس کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے، اس کے جذبات میں طوفان برپا نہیں ہوتا اور اُسے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی چیز عقل و فکر کی قوتوں کو مسخر و مفتوح کرتی ہوئی تیر کی طرح دل و جگر تک پیوست ہوتی چلی جارہی ہے۔ وہ قرآن کی سطروں کے نیچے ایک ایسی بے جان عبارت دیکھتا ہے جو لفظی ترجمہ کی چھلنی سے گذرنے کے بعد محض دوا کے خشک اجزا ہی لیے ہوئے نکلتی ہے اور ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ اس میں سے بالکل اُڑجاتی ہے جس کے اندر دوا کو اس لیے حل کیا گیا تھا کہ وہ اُسے لے کر قلب و روح کی گہرائیوں تک پہنچ جائے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کمی کوئی معمولی کمی نہیں ہے۔

قرآن کی تاثیر میں اس کی بلند تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے اس کے زورِ بیان کا حصہ اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل پگھلا دیتی تھی، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح اِدھر سے اُدھر تک تمام سرزمین عرب کو ہلا دیا تھا جس کی قوتِ تسخیر کا لوہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین مخالف تک مانتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ لوگ اس کلام کو نہ سنیں کیونکہ اس کی جادو بیانی سے انھیں ڈر لگتا تھا کہ جو اسے سنے گا وہ بالآخر اس کے آگے نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی، اگر وہ اسی طرز کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جو ہمیں اس کے ترجموں میں نظر آتی ہے تو یقیناً اسے اہلِ عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو فی الواقع حاصل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی بلاغت اعجازی بلاغت ہے اور کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو اسی شان کے ساتھ اپنی زبان میں ادا کر سکے جس کے ساتھ وہ قرآن میں ادا کیے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارے بس میں ہے، ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی ترجمانی ایسے طرز سے کریں جو دلوں میں نفوذ کرنے والا ہو۔ اس کے بغیر وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو قرآن کے مطالب کو کسی دوسری زبان میں نقل کرنے سے مقصود ہیں۔

قرآن کے تراجم سے طبائع کے پوری طرح متاثر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ کی عبارت ہوتی ہے اور اس کے بالمقابل ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظی ترجمہ کے لیے یہ طریقہ ضروری اور عین مناسب ہے کیونکہ اس کی غرض ہی یہ ہے کہ تلاوت کے ساتھ ساتھ آدمی یہ بھی معلوم کرتا جائے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ لیکن اس میں جہاں فائدہ کا یہ پہلو ہے وہیں نقصان کا بھی ایک پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ پڑھنے والا ترجمہ کی عبارت کو اُس طرح پوری توجہ کے ساتھ مسلسل نہیں پڑھ سکتا جس طرح وہ دوسری کتابوں کو پڑھتا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس آسانی کے ساتھ وہ دوسری

کتابوں کے مطالعہ سے اثر قبول کرتا ہے وہ آسانی اُسے ترجمۂ قرآن سے اثر لینے میں محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ایک اجنبی زبان کی عبارتیں بار بار اس کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہیں۔ انگریزی ترجموں میں اس سے بھی زیادہ بے اثری پیدا کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بائیبل کے ترجمہ کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبروار درج کیا جاتا ہے۔ آپ کسی بہتر سے بہتر مضمون کو لے کر ذرا اس کے فقرے فقرے کو الگ کر دیجیے اور مربوط عبارت کی شکل میں رکھنے کے بجائے انھیں اوپر نیچے نمبروار لکھتے جائیے، پھر اسے پڑھ کر دیکھیے، آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ مربوط اور مسلسل عبارت سے جو اثر آپ کے ذہن پر پڑتا تھا اس سے آدھا اثر بھی ان جدا جدا فقروں کے مطالعہ سے نہیں پڑتا۔

اس نقصان کی تلافی کے لیے مناسب صورت یہی ہو سکتی ہے کہ لفظی ترجمہ بدستور اسی طرح پیش کیا جائے جس طرح اب تک کیا جاتا رہا ہے، مگر اس کے ساتھ انہی مطالب کی ترجمانی ایک مسلسل عبارت کی شکل میں بھی ہو تاکہ لفظ لفظ اور آیت آیت کا ترجمہ معلوم کر لینے کے بعد آدمی اس ترجمانی کو بالکل اسی طرح پڑھ سکے جس طرح وہ کسی کتاب کو پڑھا کرتا ہے۔ "تفہیم القرآن" کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی نوبت جب آئے گی تو انشاءاللہ قرآن مجید کی اصل عبارت معہ ترجمۂ شاہ عبدالقادر صاحب اس کے ساتھ شامل کر دی جائے گی تاکہ بیک وقت دونوں فائدے حاصل کیے جا سکیں۔

قرآن کے لفظی ترجمہ میں نقص کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں کلام کا ربط اچھی طرح واضح نہیں ہوتا بلکہ اکثر مقامات پر بے ربطی اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کو سخت الجھن ہونے لگتی ہے۔ اہلِ ایمان تو یہ خیال کر کے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں کہ یہ کلام نجماً نجماً نازل ہوا ہے لہٰذا ایک آیت کا دوسری آیت سے اور ایک بیان کا دوسرے بیان سے تعلق ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے اُن پر کلام کا یہ رنگ دیکھ کر اُلٹا اثر پڑتا ہے، کیونکہ خدا تو درکنار، معمولی انسانوں کے کلام میں بھی اگر بے ربطی پائی جائے تو سننے اور پڑھنے والے پر کبھی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔

اس نقص کو لفظی ترجمہ سے دُور کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اور ربطِ کلام کو مصنوعی طریقہ سے بیان کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں وہ اس سے بھی زیادہ غیر مفید ہیں، کیونکہ ان کو دیکھ کر تو صریح طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اللہ میاں کی بات بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دراصل ربطِ کلام اور صرف ربط ہی نہیں بلکہ کلام کی روح کو بھی پوری طرح واضح کرنے کے لیے تین باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے جن کی طرف ہم یہاں مختصر طور پر اشارہ کریں گے۔

پہلی چیز جسے نظر میں رکھنا نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ کلام لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں نہیں آتا تھا بلکہ فرشتہ آکر دُوبدُو زبانی پیغام ادا کرتا تھا۔ اور اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان پیغامات کو مضامین اور رسالوں کی صورت میں شائع نہیں فرماتے تھے بلکہ زبانی خطبوں کی صورت میں بیان کرتے تھے۔ تحریر کی زبان اور تقریر کی زبان میں فطری طور پر بہت فرق ہوتا ہے۔ مثلاً تحریر میں ایک شبہ کو بیان کرکے اسے رفع کیا جاتا ہے مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں اس لیے ان کے شبہ کو نقل کرنے کے بجائے سلسلۂ کلام ہی میں ان کو جواب دے دیا جاتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کوئی بات بیان کرنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر نمایاں علامات کے ساتھ لکھا جاتا ہے تاکہ ربط ٹوٹنے نہ پائے لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ خطاب کا تغیر ایک جملۂ معترضہ کو سلسلہ کلام سے بآسانی الگ کر دیتا ہے۔ تحریر میں بیان کا تعلق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کے درمیان کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ اس خلا کو تو ماحول خود ہی بھر رہا ہوتا ہے۔ اب اگر آپ کو کسی تقریری بیان کی ترجمانی تحریر کی صورت میں کرنی ہو تو آپ کے لیے ناگزیر ہے کہ کلام کے الفاظ کی پابندی سے ذرا آزاد ہو کر تحریر و تقریر کے متذکرہ بالا فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے، بیان میں اس حد تک تغیر و تبدل کر دیں جس حد تک

اس تقریر کو تحریر کی شکل میں ڈھالنے کے لیے فطرۃً ضروری ہے۔ اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو حاشیہ سے مدد لے کر اس خلا کو پُر کریں۔ ورنہ اسے جوں کا توں پیش کر دینا پڑھنے والے کے لیے لامحالہ اُلجھن کا موجب ہوگا۔

مثال کے طور پر دیکھیے، سورۂ بقرہ کے تیسرے رکوع میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے بعد ان لوگوں کے انجام کا فرق بتایا گیا ہے جو اس کتاب پر ایمان لائیں اور جو اس کا انکار کر دیں۔ پھر یکایک ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا (اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی مثال دے) یہاں منکرینِ قرآن کے ایک شبہ کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ تقریر میں اس سے کوئی بے ربطی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر تحریر میں اس جواب کو کسی نمایاں علامت کے ساتھ اوپر کے سلسلۂ کلام سے ممیز نہ کیا جائے اور اس شبہ کی کسی طور پر تصریح نہ کر دی جائے جس کا جواب اس جملہ میں دیا گیا ہے تو پڑھنے والا ضرور بے ربطی محسوس کرے گا۔

یا مثلاً سورۂ قیامہ کو دیکھیے۔ بعث بعد الموت کا اثبات اور منکرینِ حشر کو تنبیہ کرتے کرتے یکایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (اسے یاد کرنے کی فکر میں جلدی جلدی اپنی زبان کو حرکت نہ دو، ہم ذمہ لیتے ہیں کہ اس مضمون کو جمع کر کے تمھیں پڑھ کر سنا دیں گے، اُس وقت جب ہم پڑھیں تو تم بھی ہمارے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا، پھر اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ذمہ ہے) اس کے بعد کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ سے پھر وہی سلسلہ تقریر شروع ہو جاتا ہے جو وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ پر ٹوٹا تھا۔

یہاں اگر ان جملہ ہائے معترضہ کو، جو تقریر کے درمیان آگئے ہیں، سیاق عبارت سے ممیز نہ کیا جائے اور یہ تصریح نہ کر دی جائے کہ نزولِ وحی کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کرتے دیکھ کر یہ جملے بطور فہمائش کے ارشاد ہوئے ہیں اور رسولِ امین نے ان کو بھی جوں کا توں نقل کر دیا ہے تو یقیناً وسطِ کلام میں چند بظاہر بالکل غیر متعلق جملے دیکھ کر ناظر کا ذہن اُلجھے بغیر نہ رہ سکے گا۔

یا مثلاً سورۂ آل عمران میں تیرھویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک جنگ اُحد پر جو مسلسل تبصرہ کیا گیا ہے اُسے پڑھیے۔ یہاں طرز بیان یہ ہے کہ ایک ایک دو دو فقروں میں جنگ کے مختلف اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، منافقین، کفار، ضعیف الایمان لوگ، مومنین مخلصین، نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور بحیثیت مجموعی مسلم جماعت سب زیر بحث آئے ہیں۔ خطاب کبھی کسی کی طرف پھرتا ہے تو کبھی کسی کی طرف۔ جگہ جگہ ایسے امور کی طرف اشارے آتے ہیں جو صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہیں۔ یہ پورا خطبہ اُس ماحول میں بالکل مربوط تھا جس میں یہ ارشاد فرمایا گیا تھا، کیونکہ اس کے مختلف فقروں کے درمیانی خلا کو خود ماحول پُر کر رہا تھا اور الفاظ سے اُس خلا کو پُر کرنا نہ صرف بے محل اور لاحاصل تھا بلکہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ شاہانہ تبصرہ کے بجائے وقائع نگار کا تاریخی بیان بن جاتا۔ لیکن اب اس کا لفظ بلفظ ترجمہ جو شخص تحریر کی صورت میں پڑھے گا اسے پورا کلام غیر مربوط نظر آئے گا۔ اس کی صحیح ترجمانی کے لیے اب یہ ناگزیر ہے کہ مستند روایات کی مدد سے ترجمان خود اس ماحول کو اپنے سامنے حاضر کرے اور اس کی تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر آیات کے درمیانی خلا کو اس طرح بھرتا جائے کہ شاہانہ تبصرہ کی شان میں فرق نہ آئے۔

دوسری اہم چیز جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے بکثرت مقامات اپنے پس منظر سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں اور کلام کی پوری ترکیب اس پس منظر کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے محض کلام کے الفاظ کو دیکھا جائے تو ساری تقریر بے ربط سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسے مواقع پر جب تک ہم لفظی ترجمہ کی حدود سے نکل کر کلام کا تعلق ٹھیک ٹھیک اس کے پس منظر کے ساتھ جوڑ نہ دیں، ہم کسی طرح اُس بے ربطی کو دور نہیں کر سکتے جو مجرد ترجمۂ الفاظ پیش کرنے کی صورت میں بظاہر نظر آتی ہے۔

اس کی توضیح کے لیے ہم سورۂ غاشیہ کو مثال میں پیش کریں گے۔ یہ سورۃ بغیر کسی تمہید کے اچانک اس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ "تمہیں اُس چھا جانے والی آفت کی بھی کچھ خبر ہے؟"۔ پھر اس آفت کے دن کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں ایک گروہ ایسی اور ایسی تکلیفوں میں مبتلا ہوگا اور دوسرا گروہ اس طرح

عیش کرے گا۔ اس کے بعد یکلخت کلام کا رُخ بدلتا ہے اور پے درپے چار سوالات کیے جاتے ہیں "یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسا بنایا گیا ہے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کیسا بلند کیا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کیسے جمائے گئے ہیں؟ زمین کو نہیں دیکھتے کیسی پھیلائی گئی ہے؟" پھر یہ سلسلۂ کلام بھی صرف انہی سوالات پر ختم ہو جاتا ہے اور کسی مزید گفتگو کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا جاتا ہے کہ "خیر، تم نصیحت کیے جاؤ، تم محض نصیحت کرنے والے ہو، ان پر کوتوال نہیں ہو۔۔۔۔"۔ اب اگر اس سورۃ کا نرا لفظی ترجمہ کوئی دیکھے تو اسے پورے مضمون میں تین مختلف مضمون نظر آئیں گے جن کا باہمی ربط سمجھنا اس کے لیے مشکل ہوگا لیکن اگر اسی مضمون کو اس کے پس منظر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ نہایت برمحل، متناسب اور مرتب کلام معلوم ہوگا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ کے نبی کو توحید اور بندگیِ رب کی طرف دعوت دیتے ہوئے کافی مدت گذر چکی ہے، اس نے ہر ممکن طریقِ استدلال سے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شرک خلافِ حقیقت ہے اور نظامِ کائنات ایک ہی الٰہ اور ایک ہی رب کے زیرِ حکم ہے، وہ اپنی قوم کو اوہام کی پیروی سے روکنے اور حقیقت کے اتباع کی طرف لانے کی ان تھک جدوجہد کرتا رہا ہے، مگر لوگ کچھ اس طرح دنیا کی زندگی میں مستغرق اور آخرت کے نتائج سے غافل ہیں کہ اس کی کوئی نصیحت ان پر اثر نہیں کرتی اور ان کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں اوپر سے پیغام آتا ہے کہ تمھیں اُس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب ایک عالمگیر آفت تمام جہان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور سعید و شقی کا انجام صاف کھل جائے گا۔ آج جو چہرے خدا سے بےخوف، دنیا کی زندگی میں مگن نظر آتے ہیں، اس وقت یہی چہرے اُترے ہوئے ہوں گے اور سخت مصیبت کی زندگی ان کو تھکا مارے گی۔ اور آج جن چہروں پر خدا ترسی چھائی ہوئی ہے، یہی چہرے اس وقت تروتازہ اور عیشِ جاودانی میں مگن ہوں گے۔ اس طرح چونکا دینے والے انداز میں آنے والی گھڑی کی اچانک خبر دے کر فرمایا جاتا ہے کیا یہ لوگ اندھے ہیں؟ اونٹ، آسمان، پہاڑ، زمین، سب کچھ رات دن دیکھتے ہیں اور پھر بھی ان چیزوں کی ساخت اور ان کے نظامِ کار میں انھیں اُس تعلیم کی صداقت کا ثبوت نظر نہیں آتا جو تم دے رہے ہو؟

اللہ کی یہ آیات جو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، کیا یہ وحدت الوہیت و ربوبیت کی شہادت دینے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ پھر اپنے نبی سے ارشاد ہوتا ہے کہ اچھا، یہ نہیں دیکھتے تو نہ دیکھیں، تم اپنا فرض ادا کیے جاؤ تمھارا کام سمجھانا ہے، کوئی نہ سمجھے تو اس کے اندر زبردستی ایمان اتار دینا تمھارا کام نہیں ہے۔ جو نہ مانے گا اور تمھاری پیروی سے منہ موڑے گا وہ پلٹ کر تو بہرحال ہمارے ہی پاس آئے گا، پھر ہم خود اس کا حساب چکا دیں گے۔

دیکھیے، اس پس منظر میں سورہ کا مضمون کس طرح چمک اُٹھتا ہے اور اس روشنی میں سورۃ کی تمہید، مرکزی تقریر اور خاتمہ کے درمیان کس قدر نفیس اور کتنا محکم ربط نظر آنے لگتا ہے۔

تیسری چیز جو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ قرآن کی مخصوص اصطلاحی زبان کی رعایت ہے۔ قرآن کے بکثرت الفاظ اپنے لغوی مفہوم سے بہت زیادہ وسیع معنویت اپنے اندر رکھتے ہیں اور ان میں یہ معنویت قرآن کے اندازِ بیان اور طریقِ استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ ان الفاظ کے معانی میں وسعت پیدا کرنے کے بعد قرآن نے ان کو مختلف مواقع پر مختلف ضمنی مفہومات میں استعمال کیا ہے اور یہ بات سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے کہ ایک لفظ کے ضمنی مفہومات میں سے کس مقام پر کونسا مفہوم مراد ہے۔ لفظی ترجمہ کے التزام کی صورت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ لفظ کو یا تو جوں کا توں رکھ دیا جائے، یا لغت کے اعتبار سے اس کا جو ترجمہ ہوسکتا ہو وہی درج کیا جائے، لیکن اس سے نہ صرف یہ کہ معانی قرآن کی وہ وسعتیں اور نزاکتیں پوری طرح سامنے نہیں آتیں جو ان اصطلاحی الفاظ میں مضمر ہیں، بلکہ اکثر مقامات پر ترجمہ پڑھنے والے کو سیاقِ عبارت میں ایک بے محل لفظ دیکھ کر سخت الجھنوں اور غلط فہمیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کفر ہی کو لے لیجیے جسے قرآن نے عدمِ ایمان کی بہت سی مختلف حالتوں کے لیے ایک ہی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کہیں اس سے مراد مکمل غیر ایمانی حالت ہے، کہیں یہ محض انکار کے معنی میں آیا ہے، کہیں اس سے محض ناشکری و احسان فراموشی مراد لی گئی ہے، کہیں مقتضیات

ایمان میں سے ایک یا چند کو پورا نہ کرنا مراد ہے، کہیں اعتقادی اقرار مگر عملی انکار یا نافرمانی کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے، کہیں ظاہری اطاعت مگر باطنی بے اعتقادی پر اس کا اطلاق ہوا ہے، اور کہیں کفر کا لفظ عام کافرانہ طرز عمل کے بجائے کسی خاص چیز کے نہ ماننے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو قریب ہی سیاق عبارت میں کسی جگہ مذکور ہوتی ہے۔ اب اگر ہم ہر جگہ ترجمہ میں کفر کا لفظ جوں کا توں رکھ دیں، یا کسی ایک لفظ مثلاً انکار وغیرہ کو اس کے ترجمہ کے طور پر لکھتے چلے جائیں، تو بلاشبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہوگا لیکن اول تو ناظرین پر مطلب پوری طرح واضح نہ ہو سکے گا اور مزید براں بعض مواقع پر سلسلۂ کلام میں اس لفظ کی مناسبت بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آ سکے گی۔ پس قرآنی مطالب کی تفہیم اور ربطِ عبارت کی توضیح کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایسے وسیع المعنی اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ کرنے کے بجائے اس امر کی کوشش کی جائے کہ ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے ان کا مفہوم ادا کیا جائے اور جن اصطلاحات کی تعبیر کسی ایسے طریقہ سے ممکن نہ ہو کہ ترجمانی کا حُسن اور کلام کی فصاحت برقرار رکھی جا سکے، ان کو بعینہٖ نقل کر کے دوسرے طریقوں سے تفہیم کی سعی کی جائے۔

ان امور کے ذکر سے میرا مقصد لفظی ترجمہ کی اہمیت گھٹانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے بندوں تک اللہ کے کلام کی تعلیمات پہنچانے میں جو کسر بھی باقی ہے، اس کی اہمیت واضح کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بزرگوں نے اردو زبان میں مختصر و مفصل تفسیریں لکھ کر یہ کسر پوری کرنے کی کوشش کی ہے، اور حال میں ترجمانی کے طرز پر بھی بعض کوششیں کی گئی ہیں، لیکن ان مساعی کو عزت و وقعت کے ساتھ دیکھنے کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عام غیر عربی داں ناظرین، بلکہ بہت سے عربی داں ناظرین کی بھی بعض ضروریات ابھی ایسی رہ جاتی ہیں جو ان سے پوری نہیں ہوتیں۔ یہ احساس مجھے ایک مدت سے تھا، مگر اپنی بے بضاعتی اور اس کام کی عظمت و نزاکت کو دیکھ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں دعا کرتا رہا کہ کوئی مجھ سے بہتر شخص بلکہ بالغ النظر اشخاص کا ایک گروہ اس خدمت کی طرف توجہ کرے، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ابھی تک کہیں اس خاص پہلو سے قرآن کی خدمت انجام دینے کا خیال پیدا نہیں ہوا ہے۔ دوسری طرف میں دیکھ رہا ہوں کہ قرآن کے علم کو اس طریقہ سے پیش کرنے کی ضرورت بڑھتی اور شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آخر کار

محض اللہ کے بھروسہ پر میں نے ایک نہایت نازک وقت میں اس کام کا عزم کیا ہے جب اس کام کو دیکھتا ہوں تو ترجمہ و تفسیر دونوں کی بہ نسبت ترجمانی کی ذمہ داری زیادہ سخت نظر آتی ہے کیونکہ اس میں ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کلامِ الٰہی کی غلط تعبیر کر کے آدمی اجر کے بجائے کہیں اُلٹا وزر نہ مول لے لے جب اپنے آپ کو تولتا ہوں تو اس بھاری ذمہ داری کے مقابلہ میں بہت ہلکا پاتا ہوں جب گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک برسرِ انحطاط اور اخلاقی حیثیت سے گری ہوئی قوم میں، جو فتنوں کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے، جسے فتنہ کہیں نہ ملے تو کوشش کر کے اسے خود پیدا کرتی ہے، جس کی کج نگاہی و کج خوئی اتنی بڑھ چکی ہے کہ راستی میں بھی کجی ہی ڈھونڈتی ہے، ایسا کوئی اقدام کرنا گویا جنگل کے تمام کانٹوں کو اُلجھنے کی دعوت دینا ہے۔ مگر جب اس طرف نگاہ جاتی ہے کہ ہدایت کے پیاسے بندوں تک کلام اللہ کا فیض پہنچانے کے لیے اس نوعیت کی ایک کوشش بالکل ناگزیر ہو چکی ہے اور تبلیغ دین کی راہ میں اس سے مدد لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو میرا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ جو کچھ تو خود کر سکتا ہے اس کے کرنے میں ہرگز دریغ نہ کر اور جو کچھ تیری مقدرت سے بالاتر ہے اس کے لیے اللہ کی مدد پر بھروسہ کر، وہی نورِ علم دینے والا ہے، وہی مشکلیں آسان کرنے والا ہے، وہی کامیابی کے اسباب فراہم کرنے والا ہے، وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔

ازروئے قاعدہ مارچ میں جماعتِ اسلامی کا اجتماعِ عام منعقد ہونا چاہیے تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے جو اضطرابی حالات ملک میں پیدا ہو چکے ہیں ان کی وجہ سے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس وقت اجتماعِ عام کو ملتوی کر کے صرف اہلِ حل وعقد کی مجلسِ شوریٰ منعقد کر لی جائے چنانچہ فروری کے آخری ہفتہ میں مجلس منعقد ہوئی جن جن حضرات کو دعوت دی گئی تھی، الحمد للہ کہ وہ سب تشریف لے آئے تھے۔ صرف جنوبی ہند کے ارکانِ شوریٰ قلتِ وقت اور بُعدِ مقام کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ جملہ شرکاء کی تعداد ۱۶ تھی۔ جن امور پر غور کیا گیا وہ حسبِ ذیل تھے:

(۱) تشکیلِ جماعت کے بعد سے اب تک جس قدر کام ہوا ہے اس پر جملہ پہلوؤں سے تنقید۔

(۲) آئندہ کے لیے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں۔

(۳) جنگ کی آگ ملک کے اندر پہنچ جانے کی صورت میں جماعت کا طرزِ عمل۔

تین روز تک اجتماع رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ جملہ امور کامل اتفاقِ رائے سے طے ہوئے تفصیلی کارروائی تو مقامی جماعتوں کو بھیجی جا رہی ہے، اور آئندہ ان صفحات میں بھی اس کے ترشحات حسبِ موقع پیش ہوتے رہیں گے، مگر سر دست آخری مسئلہ کے متعلق مختصراً کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔

یہ جنگ درحقیقت اپنی نمایاں علامات کی بنا پر انسانیت کے لیے ایک عذابِ الٰہی ہے اور یہ رب العالمین کے ساتھ شرک کرنے کی لازمی سزا ہے جو بغاوت و سرکشی کی حد ہو جانے کے بعد نافذ ہوئی ہے۔ قرآن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کو دیکھ لینے کے بعد توبہ کرنا لاحاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ یہ عذاب سر پر آئے، ہر اس شخص کو جو مغضوبین و معذبین کے سے انجام سے دوچار ہونا نہیں چاہتا، اعتقاد اور عمل دونوں کے شرک سے تبرّی کرنی چاہیے اور اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس پر استغفار کرنے کے ساتھ آئندہ کے لیے اپنے حقیقی رب کی بندگی و اطاعت پر ثابت قدم ہو جانا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ اس کے نتیجہ میں آفاتِ جنگ سے کامل تحفظ نصیب ہی ہو جائے، کیونکہ فاسقین و ظالمین کے درمیان رہنے کے جو لازمی نتائج ہیں، اُن سے بچنا بہر حال مشکل ہے، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّنَا، مگر اس سے اتنا تو ہو گا کہ ہلاک ہونے کی صورت میں لعنت زدہ ہو کر تو اپنے رب کے سامنے پیش نہیں کیے جائیں گے۔ جو لوگ جماعتِ اسلامی میں شامل ہوئے ہیں انھیں نہ صرف خود استغفار کرنا چاہیے بلکہ ان کا فرض ہے کہ انتھک جدوجہد کے ساتھ اللہ کے بندوں کو اس لعنت اور عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔ یہ وقت ان کے لیے انتہائی سعی و عمل کا ہے جس قول و فعل کی شہادت انھوں نے دی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس تھوڑی سی فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں اور جہاں تک ممکن ہو اپنے گردوپیش کے انسانوں کو توحید کی دعوت دیں۔

مزید براں اس وقت جماعت کے پیش نظر یہ سوال بھی نہایت اہم ہے کہ دینِ حق کی خدمت کے لیے جو تھوڑی سی جمعیت ہم نے بہم پہنچائی ہے وہ درندگی کے اس ہنگامہ میں منتشر نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مقامی جماعتوں کے امراء کو ہدایات بھیجی جا رہی ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو اور اپنی تمام قوتوں کو اللہ کی راہ میں وقف کر چکے ہیں، لہٰذا ہم ان کو راہِ خدا کے سوا کسی کام میں ضائع کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ جس حد تک اس وقت انھیں اللہ کے کام میں استعمال کرنے کا موقع ہے، ہم پورا پورا استعمال کریں گے اور جس حد تک اس وقت موقع نہیں ہے، آئندہ کسی بہتر خدمت کے لیے ان کو محفوظ رکھیں گے۔

تفہیم القرآن

الفاتحہ

یہ نبوّت محمّدی کے بالکل ابتدائی زمانہ کی سُورت ہے۔ بلکہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمل سُورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ یہی ہے۔ اس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں جو سورۂ علق، سورۂ مزمّل اور سورۂ مدثّر وغیرہ میں شامل ہیں۔

اس کا مشہور نام "فاتحہ" ہے، یعنی قرآن کی افتتاحی سورت، یا اس کا دیباچہ۔ اس کے دوسرے نام بھی ہیں، مثلاً اُمّ القرآن، اساس القرآن، وغیرہ۔ درحقیقت اس میں قرآن کی پوری تعلیم کا لبّ لباب اور اس کی روح کا نچوڑ آگیا ہے۔ اس کتاب کے لیے اس سے بہتر کسی دیباچہ کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

اس کا انداز دعائیہ ہے۔ اللہ اپنے پیغمبر کو، اور پیغمبر کے واسطے سے دوسرے انسانوں کو سکھا رہا ہے کہ تم میرے حضور یہ دعا کرو۔ اس پیرایہ میں اللہ نے ضمناً یہ تعلیم بھی دیدی کہ انسان کا عقیدہ کیا ہونا چاہیے، اُس کے لیے صحیح طرز عمل کیا ہے، اور اس کے لیے وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز کونسی ہے جس کی درخواست اُسے اللہ سے کرنی چاہیے۔

اللہ کے نام سے جو رحمانؔ و رحیمؔ ہے

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا ربؔ ہے ، رحمان اور رحیم ہے ، روز جزا کا مالکؔ ہے۔

؎۱ رحمان = وہ جس کی رحمت ہمہ گیر و عالمگیر ہے۔

؎۲ رحیم = وہ جس کی مستقل صفت ہی رحم کرنے کی ہے۔

؎۳ قرآن میں یہ فقرہ محض اللہ کی ثنا و صفت بیان کرنے کی غرض ہی سے ارشاد نہیں ہوا ہے ، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس میں ایک بڑی حقیقت پر سے پردہ بھی اٹھایا گیا ہے، اور وہ حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دنیا میں جہاں جس چیز میں جس شکل میں کوئی حسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے، اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی دیوتا، کسی سیّارے، غرض کسی مخلوق کا کمال بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسانمند اور شکر گزار، نیاز مند اور خدمتگار بنیں تو وہ خالق کمال ہے نہ کہ صاحب کمال۔

؎۴ رب = مالک، آقا، مربی، پرورش کرنے والا، خبرگیری کرنے والا۔

؎۵ دنیا کی اس زندگی میں جو پردہ انسان کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے اس کی وجہ سے انسان کو بہتوں کے متعلق یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس کی قسمت کا فیصلہ، اس کے بھلے اور برے کا اختیار انہی کے ہاتھ میں ہے۔ مگر روز جزا میں جبکہ انسان اپنے پورے کارنامۂ زندگی کا حساب دینے کے لیے خدا کے سامنے حاضر ہوگا، یہ حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو جائے گی کہ تمام اختیار کا مالک اللہ ہے، اس کی قسمت کا فیصلہ کسی کے ہاتھ میں نہیں صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ انسان دنیا کے مظاہر سے دھوکا نہ کھائے، جو حقیقت مرنے کے بعد چشم سر سے دیکھے گا، اسے اس زندگی ہی میں چشم دل سے دیکھ لے اور یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھے کہ اصل قابل لحاظ وہ نہیں ہیں جو دنیا میں بظاہر مالک محسوس ہوتے ہیں بلکہ وہ ہے جو آخری فیصلہ کے دن سیاہ و سپید کا بے شریک مالک ثابت ہوگا۔

ہم تیری ہی عبادت[۵] کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں

ہمیں سیدھا راستہ دکھا[۶]، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا[۷]، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں[۸]۔

البقرہ

اس سورۃ کا نام "بقرہ" اس لیے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید کی ہر سورۃ میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع عنوانات تجویز نہیں کیے جا سکتے۔ عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مالدار ہے، مگر بہرحال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے

۵؎ عبادت = بندگی، غلامی، اطاعت، پرستش، گرویدگی۔

۶؎ سیدھے راستہ سے مراد دنیوی زندگی کے ہر شعبہ میں خیال، عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہے جو بالکل صحیح ہو، جس پر چل کر انسان براہ راست اپنی فلاح و سعادت کی انتہائی منزل تک پہنچ جائے جس میں غلط بینی اور غلط کاری کا خطرہ نہ ہو۔

۷؎ انعام سے مراد درحقیقت مال و دولت اور دنیوی جاہ و عزت کی بخشش نہیں ہے، بلکہ اللہ کی رضا اور اس کی بارگاہ میں مقبولیت، اور اس کی میزان میں قدر کا مستحق قرار پانا ہے۔ رہیں دنیوی نعمتیں، تو وہ اگر اللہ کے قانون شرعی کی اطاعت کرتے ہوئے حاصل ہوں تو ان پر بھی انعام کا اطلاق ہوگا، ورنہ وہ ابتلا اور استدراج کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ آگے چل کر قرآن میں اس حقیقت کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے۔

۸؎ معتوب شخص اور بھٹکے ہوئے شخص میں فرق یہ ہے کہ بھٹکا ہوا وہ ہے جس پر سیدھا راستہ واضح ہی نہ ہوا ہو اس لیے وہ غلط راستوں میں بھٹکتا پھر رہا ہو، اور معتوب وہ ہے جس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو مگر وہ اپنی شرارتِ نفس کی وجہ سے قصداً اسے چھوڑ کر غلط راستہ پر چلے۔

ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سورۃ کو بقرہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ "وہ سورۃ جس میں گائے کا ذکر ہے"۔

اس سورۃ کا بیشتر حصہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔ اور کمتر حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبت مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ سود کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اتری تھیں۔ سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اسی سورۃ میں ضم کر دیا گیا ہے۔

اس سورۃ کو سمجھنے کے لیے پہلے اس کا تاریخی پس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:۔

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکہ میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی خطاب بیشتر مشرکین عرب سے تھا جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینہ سے بالکل متصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہوگئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رسوم اور

طریقے رواج پاگئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراۃ میں کوئی ثبوت نہ تھا خود توراۃ میں انھوں نے خدا کے کلام کے ساتھ انسانی کلام کو خلط ملط کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک اس میں لفظاً یا معنیً محفوظ تھا اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علماء اور مشائخ، ان کے سرداران قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی۔ اور اپنے اس بگاڑ سے اُن کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انھیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام (مسلم) تک بھول گئے تھے، محض یہودی بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے محض نسل اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں چنانچہ سورۂ بقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خصوصیات کے مقابلہ میں حقیقی دین کے اصول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی امت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دینداری کے مقابلہ میں حقیقی دینداری کس چیز کا نام ہے، دین حق کے بنیادی

اصول کیا ہیں اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکہ میں تو معاملہ صرف اصول دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظام سیاسی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورۃ کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ تر انہی ہدایات پر مشتمل ہیں جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسب ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کشمکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختہ مشق بنتے تھے مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینہ میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے تو صورت حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دوسری طرف تمام عرب اس جماعت اور اس تحریک کا استیصال کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اب اس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا کہ اوّلاً وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً وہ مخالفین کا برسر باطل ہونا اس طرح ثابت و مبرہن کر دے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں شبہ نہ رہے۔ ثالثاً بے خان ومان ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مزاحمت

سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر و فاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہو گئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، پورے صبر و ثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلح مزاحمت کا مسلح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کی ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمائش سے قبول نہ کریں، تو انھیں جاہلیت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹا دینے میں بھی تامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان پانچوں امور کے متعلق ابتدائی ہدایات دی ہیں، بعد میں یہ کشمکش جتنی جتنی بڑھتی گئی اسی کے مطابق زیادہ مفصل ہدایات بعد کی سورتوں میں نازل ہوتی رہیں۔

(۴) دعوتِ اسلامی کے اس مرحلہ میں ایک نیا عنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا، اور یہ منافقین کا عنصر تھا۔ اگرچہ اس کے ابتدائی آثار مکہ کے آخری زمانہ میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہ صرف اس حد تک تھے کہ کچھ لوگ اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف ہو گئے تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی، اپنے دنیوی تعلقات کا انقطاع، اور اُن مصائب و شدائد کا نزول بھی برداشت کر لیں جو اس مسلکِ حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے:۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ

برپا کرنے کے لیے جماعت مسلمین میں داخل ہو جاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اس جماعت کے دائرۂ اقتدار میں گھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفین اسلام سے بھی ربط رکھیں تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے متمتع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردد تھے، انھیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا، مگر چونکہ ان کے قبیلہ، یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے اس لیے یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امر حق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہو چکے تھے مگر جاہلیت کے طریقے چھوڑنے اور اخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔ سورۂ بقرہ کے نزول کے وقت ان منافقین کے ظہور کی محض ابتدا تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں، بعد میں جتنی جتنی ان کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں اسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھیجی گئیں۔

اللہ کے نام سے، جو رحمان و رحیم ہے

الف، لام، میم[۱]۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں[۲]۔

۱؎ یہ حروف مقطعات قرآن کی بعض سورتوں کے آغاز میں لائے گئے ہیں۔ یہ جس سورۃ کی ابتدا میں پائے جاتے ہیں اس کے لیے نام یا علامت کا فائدہ بھی دیتے ہیں، افتتاح کلام کے لیے اصل بات شروع کرنے سے پہلے خطیب کی طرف سامعین کی توجہ کھینچنے کا کام بھی ان سے لیا گیا ہے، اور ان میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ یہ کلام اگرچہ انہی حروف والفاظ سے مرکب ہے جو تمھاری زبان میں مستعمل ہیں مگر پھر بھی تم اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہو، اسی لیے جن جن سورتوں کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں ان سب میں قرآن کے اعجاز اور اس کے دلیل نبوت ہونے کا دعویٰ موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس طرز بیان سے نامانوس نہ تھے کیونکہ انھوں نے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ ہو)

یہ ہدایت ہے[ف۵] متقی[ف۶] لوگوں کے لیے جو غیب[ف۷] پر ایمان لائیں، نماز قائم کریں[ف۸]، جو رزق ہم نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) قرآن کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود کبھی حروف مقطعات کے استعمال پر اعتراض تو درکنار کسی شبہ تک کا اظہار نہ کیا۔

ف۴ اس کا ایک سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ "بیشک یہ اللہ کی کتاب ہے"۔ مگر ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دنیا میں جتنی کتابیں امور مابعد الطبیعت اور حقائق ماوراء ادراک سے بحث کرتی ہیں وہ سب قیاس و گمان پر مبنی ہیں، اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہوسکتے خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سراسر علم حقیقت پر مبنی ہے، اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ف۵ مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب سراسر رہنمائی ہے، مگر دنیا میں زندگی بسر کرنے کا جو راستہ یہ بتاتی ہے اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہی اس پر چل سکتے ہیں، بلکہ وہی لوگ اس راستہ کو دیکھ سکتے اور اس کی صحیح قدر جان سکتے ہیں جن میں یہ صفات پائی جائیں۔

ف۶ متقی = لغوی معنی: "اپنا بچاؤ کرنے والا"۔ اصطلاحی معنی: "وہ جو خدا کی ناراضی سے ڈرتا ہو، ان برائیوں سے بچنا چاہتا ہو جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں، اور ان بھلائیوں پر عمل کرنے کا خواہشمند ہو جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں"۔ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہو، جسے بھلے اور برے کی تمیز سے کوئی دلچسپی، برائی سے بچنے کی کوئی فکر، بھلائی کے طریقہ کی کوئی جستجو نہ ہو، اور جو اخلاقی قیود سے آزاد رہ کر بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہو اس کے لیے قرآن میں کوئی ہدایت نہیں۔

ف۷ غیب سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، آخرت۔ ان حقیقتوں کو نبی کے اعتماد پر تسلیم کر لینے کا نام ایمان بالغیب ہے، یعنی "بے دیکھی چیز کو ماننا"۔ جو شخص محسوسات سے ماوراء کسی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہو اس کا نقطۂ نظر لامحالہ مادہ پرستانہ ہوگا۔ اس کے لیے ایک قدم بھی اس راستہ پر چلنا محال ہے جو قرآن پیش کرتا ہے، کیونکہ اس راستہ کا تو سارا دارومدار ہی اللہ کے اقتدار اعلیٰ (باقی صفحہ ۲۴ پر)

ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کریں[۱]، جو ہدایت تم پر[۲] نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی اس کو قبول کریں[۳]، اور آخرت پر یقین رکھیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے صحیح روّیہ پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

جو لوگ ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں، ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انھیں خبردار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) اور اس کی ہدایت بذریعہ وحی اور آخرت کی بازپرس کو ماننے پر ہے۔

۵ اقامت صلوٰۃ یا نماز قائم کرنا ایک جامع اصطلاح ہے جس میں نہ صرف انفرادی حیثیت سے تمام شرائط و قواعد کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا اور ہمیشہ ادا کرتے رہنا، بلکہ اجتماعی حیثیت سے نماز کا باقاعدہ نظام قائم کرنا بھی شامل ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لیے یہ بھی ناگزیر شرط ہے، کیونکہ جو شخص اس راستہ پر عملاً چلنے کے لیے تیار نہ ہو، اس کا محض راستہ کا جان لینا اور مان لینا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اور اس راستہ پر عملاً چلنے کے لیے جو چیز آدمی کو تیار کرتی، اور اس کی استعداد عمل کو پرورش کرتی ہے وہ نماز ہی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی وہ تنگ دل نہ ہوں، زر پرست نہ ہوں، ان کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حقوق مقرر کیے جائیں انھیں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، جس چیز پر ایمان لاتے ہیں اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔

سلہ تم کا خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

سلہ یہ ایک عام غلطی ہے کہ اسلام کی تاریخ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کی جاتی ہے اور آنحضرت کو اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ گویا آپ ہی سے اسلام کا آغاز ہوا۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پچھلے انبیا اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا محض رواداری کے قبیل کی ایک چیز ہے۔ حالانکہ در اصل ابتدائے آفرینش سے جتنے بھی انبیا آئے ہیں، ان کا دین یہی اسلام تھا، اور جتنی کتابیں اللہ کی طرف سے آئیں ان سب کی وہی ایک تعلیم تھی جو قرآن میں دی گئی ہے۔ قرآن اور نبوت محمدی اس سلسلہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اسلام قبول کرے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ انبیا اور کتب الٰہی کے پورے سلسلہ سے اپنا تعلق جوڑے، نہ کہ اس کی ایک کڑی سے۔

کرو یا نہ کرو بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے[۱]، ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے، اور وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ ع ۱

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اپنی دانست میں اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں، حالانکہ فی الواقع وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں[۲] مگر نہیں سمجھتے۔ اُن کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا[۳]، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کو دردناک سزا ملنے والی ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انھوں نے

٭۱ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے مہر لگا دی تھی اس لیے انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے ان بنیادی امور کو رد کر دیا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی۔ اس مہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو۔ جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقہ کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے تو اس کا ذہن اس طرح بالکل اُلٹی رفتار پر چل پڑتا ہے کہ آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، اور آپ کے طریقہ کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کے دل پر مہر لگی ہوئی ہے۔

٭۲ یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کے لیے مفید ہوگی، حالانکہ دراصل یہ ان کو دنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔

٭۳ بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔ اور اللہ کے اس بیماری میں اضافہ کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ اس منافقانہ روش کی سزا وہ انھیں فوراً نہیں دیتا بلکہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی منافقانہ چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر وہ اور زیادہ مکمل منافق بنتے چلے جاتے ہیں۔

یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں — خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد[۵۱] ہیں مگر انھیں شعور نہیں ہے۔
اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ[۵۲] تو
انھوں نے یہی جواب دیا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں[۵۳]؟ — خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف
ہیں مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، اور
جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں[۵۴] سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان
لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں — اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ ان کی رسّی دراز کیے جاتا ہے
اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے
بدلے گمراہی خرید لی، مگر یہ سودا بھی ان کے لیے نفع بخش نہ ہوا[۵۵]، اور یہ ہدایت قبول کرنے والے تو تھے ہی

---

[۵۱] لگائی بجھائی، سازشیں کرنا، ہر فریق کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا، طرفین کو اپنی مدد کا جھوٹا یقین دلانا اور وقت پر کسی کے ساتھ وفا نہ کرنا، اپنی اغراض کے لیے حق و صداقت کا راستہ روکنا، یہ منافق کا شیوہ ہے اور اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے نہ کہ اصلاح ہوتی ہے۔ مگر منافق ہمیشہ اپنے آپ کو مصلح ہی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

[۵۲] یعنی جس طرح دوسرے مسلمان دیانت اور راستی کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں اسی طرح تم بھی اگر اسلام قبول کرتے ہو تو ایمانداری کے ساتھ سچے دل سے قبول کرو۔

[۵۳] وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مشقتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق اور راستی کی خاطر تمام ملک کی دشمنی مول لے لی جائے۔ ان کے خیال میں عقلمندی یہ تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملہ میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

[۵۴] شیطان کے معنی سرکش، متمرّد، شوریدہ سر کے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

نہیں ۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب سارا ماحول روشن ہو گیا تو اللہ نے اِن کا نورِ بصارت سلب کر لیا اور اِنھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں اِنھیں کچھ نظر نہیں آتا[۱۵]۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں[۱۶] یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑاکے سن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ اللہ نے ان منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بجلی کی چمک سے ان کی یہ حالت ہے

(بقیہ صفحہ ۲۶) مراد ہیں اور کہیں جن۔ اس مقام پر شیاطین کا لفظ ان بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اُس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

[۱۴] اس سارے معاملہ کو تجارت سے تعبیر کرنے میں ایک لطیف تعریض ہے۔ دراصل وہ یہ سب کچھ کاروباری ذہنیت ہی کے ساتھ کر رہے تھے۔ ان کے ذہن سوداگری سے بالاتر کسی چیز کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۵] مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہِ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا، تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے اُن پر تو ساری حقیقتیں روشن ہو گئیں، مگر یہ منافق جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ "اللہ نے نورِ بصارت سلب کر لیا" کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب انھوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلمتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انھیں اسی کی توفیق عطا فرما دی۔

[۱۶] حق بات سننے کے لیے بہرے، حق گوئی کے لیے گونگے، حق بینی کے لیے اندھے۔

کہ گویا عنقریب ان کی بصارت غائب ہو جائے گی جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں[۱]۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا[۲]، کہ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔ ع ۲

لوگو! بندگی[۳] اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمھارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمھارے بچنے[۴] کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار

---

[۱] یہ پہلی مثال ان منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مصلحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ دوسری مثال ان کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعف ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا، اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مجاہدہ ہے جو تحریک اسلامی کے مقابلہ میں اہل جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حصہ میں ان کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور جب مشکلات کے دل بادل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات نفس اور ان کے تعصبات جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

[۲] یعنی جس طرح پہلی قسم کے منافقین کا نور بصارت اس نے بالکل سلب کر لیا، اسی طرح اللہ ان کو بھی حق کے لیے اندھا بہرا بنا سکتا تھا، مگر اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ جو کسی حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہو اسے اتنا بھی نہ دیکھنے سننے دے۔ جس قدر حق دیکھنے اور حق سننے کے لیے یہ تیار تھے اسی قدر سماعت و بصارت اللہ نے ان کے پاس رہنے دی۔

[۳] اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور کس قسم کے نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے بعد اب تمام نوع انسانی کے سامنے وہ چیز پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بلانے کے لیے قرآن آیا ہے۔

[۴] بچنے سے مراد دنیا میں غلط بینی و غلط کاری سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے محفوظ رہنا ہے۔

نکال کر تمھارے لیے رزق بہم پہنچایا، پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل نہ ٹھیراؤ۔ ؎۱
اور اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ جو کتاب ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے وہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ ؎۲ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، ؎۳ جو مہیا کی گئی ہے منکرینِ حق کے لیے۔۔۔ اور اے پیغمبر، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں انھیں خوشخبری دیدو کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہوں گے۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے، جب کوئی پھل انھیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہونگی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے ۔۔۔ ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز

؎۱ یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمھیں معلوم ہے کہ یہ سب تخلیق و تدبیر اللہ ہی کی ہے تو تمھاری بندگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے، دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل ٹھیرانے سے مراد یہ ہے کہ بندگی کی مختلف انواع میں سے کسی نوع کا رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ بندگی کی یہ انواع کون کون سی ہیں جنھیں اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔

؎۲ اس سے پہلے مکہ میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینہ پہنچ کر پھر اسی کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔

؎۳ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ ہوگے بلکہ تمھارے وہ بُت بھی وہاں تمھارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنھیں تم نے اپنا معبود و مسجود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے تھے۔

کی تمثیلیں دے[1]۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انھیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے[2]۔ اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق[3] ہیں، جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[4]، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، اور اس روش سے وہ خود ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

تم اللہ کے ساتھ کفر و بغاوت کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمھاری جان سلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر

---

[1] یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو مخالفین کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر توضیح مدعا کے لیے مکڑی، مکھی وغیرہ کی تمثیلیں دی گئی ہیں۔ اس پر ان لوگوں کا اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلام الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔

[2] یعنی جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے ان کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے اُلٹے نتائج نکال کر حق سے اور زیادہ دور چلے جاتے ہیں برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں ان کو انہی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتی ہیں۔

[3] فاسق = نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

[4] بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایت جاری کرتا ہے اس کو عربی محاورہ میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تعمیل ان پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے جس کی رو سے تمام نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے۔ "مضبوط باندھ لینے کے بعد" سے اشارہ اس طرف ہے کہ آدم کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔

ع۳

اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم[۵۵] رکھنے والا ہے۔

پھر ذرا[۵۶] اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں[۵۷] سے کہا تھا کہ "میں زمین میں

---

۵۴ سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے اس کا تعین مشکل ہے۔ انسان ہر زمانہ میں آسمان، یا بالفاظ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

۵۵ اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر متنبہ فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ تم اس خدا کے مقابلہ میں کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے کی جرأت، کیسے کرتے ہو جو تمہاری تمام حرکات سے باخبر ہے، جس سے تمہاری کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے، اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے، جب اس کے سوا اور کسی سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو تو آخر اس سے روگردانی کرنے میں کیا فائدہ تم نے دیکھا ہے؟

۵۶ اوپر کے رکوع میں بندگی رب کی دعوت اس بنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمہارا خالق ہے، پروردگار ہے، اُسی کے قبضۂ قدرت میں تمہاری زندگی و موت ہے۔ اور جس کائنات میں تم رہتے ہو اس کا مالک و مدبّر وہی ہے، لہٰذا اس کی بندگی کے سوا تمہارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بنیاد پر دی جا رہی ہے کہ اس دنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے تو بدترین بغاوت کے مجرم ہوگے اور بدترین انجام دیکھو گے۔

اس سلسلہ میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ اُن نتائج سے بہت زیادہ قیمتی ہیں جو زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ایک خلیفہ[۹] بنانے والا ہوں"۔ انھوں نے عرض کیا " کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا[۱۰]؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں[۱۱]"۔ فرمایا " میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے[۱۲]"۔ اس کے بعد اللہ نے

(بقیہ صفحہ ۳۱) اور انھیں قیاس وتخمین سے ربط دے کر آدمی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

[۸] مَلَک کے اصل معنی عربی میں "پیامبر" کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو تشخص نہ رکھتی ہوں، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنت الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۹] خلیفہ = وہ جو کسی کی ملک میں اُس کے تفویض کردہ اختیارات اُس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقہ سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری و بغاوت کے افعال ہوں گے۔

[۱۰] یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔ وہ "خلیفہ" کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیر تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات سپرد کیے جانے والے ہیں مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنت کائنات کے اس نظام میں کسی با اختیار مخلوق کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں تو سلطنت کے جس حصہ میں بھی ایسا کیا جائے گا وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اسی بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

[۱۱] اس فقرہ سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں (باقی صفحہ ۴۳ پر)

آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے[۵۵]، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ انھوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے[۵۶]۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں"۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ جب اس نے ان کو سارے نام

(بقیہ صفحہ ۳۲) مرضی مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادب کر رہے ہیں، اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکے۔ (تسبیح کا لفظ ذو معنی ہے، اس کے معنی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں، اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنی ہیں، ایک تقدس کا اظہار و بیان، دوسرے پاک کرنا)

۵۴ یہ فرشتوں کے دوسرے شبہ کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو وہ کافی نہیں ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۵ انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعہ سے اشیاء کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے، لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسماء اشیاء پر مشتمل ہیں۔ آدم کو سارے نام سکھانا گویا ان تمام اشیاء کا علم دینا تھا جن کے نام انھیں سکھائے گئے تھے۔

۵۶ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دوسرے محکموں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبہ کے متعلق چاہے وہ اس شعبہ کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو میسر نہیں ہے۔

بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اُسے بھی میں جانتا ہوں"۔

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جُھک جاؤ تو سب جُھک گئے[۵۲] مگر ابلیس[۵۳] نے

---

[۵۱] یہ مظاہرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے پہلے شبہ کو رفع فرما دیا۔ گویا اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ میں اسے صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں بلکہ علم بھی دے رہا ہوں، اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمھیں ہوا وہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو صلاح کا بھی ہے اور وہ اس سے زیادہ وزنی، زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

[۵۲] یعنی زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقہ میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے اُن اختیارات کو استعمال کرنا چاہے جو ہم نے اُسے عطا کیے ہیں، اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمھارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنا، نیکی کرنا چاہے یا بدی، دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اُسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں، تمھیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی حصہ کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس حصہ میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں، اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے اس وقت تک اُس کا ساتھ دیتے رہیں قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انھیں ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقہ کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے حتیٰ کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں (باقی صفحہ ۵۳ پر)

انکار کیا، اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا[۵۹]۔

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رُخ نہ کرنا[۶۰] ورنہ ظالموں[۶۱] میں شمار ہو گے۔ آخر کار شیطان نے[۶۲] ان دونوں

(بقیہ صفحہ ۳۴) ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں کشاں کشاں دارالفاسقین کی طرف لیے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدم کے لیے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۵۳ ابلیس = لفظی ترجمہ "انتہائی مایوس"۔ اصطلاحاً یہ اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم اور بنی آدم کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو شیطان بھی کہا جاتا ہے اور جہاں کوئی قرینہ ایسا نہ ہو کہ انسان مراد لیا جا سکے وہاں لفظ شیطان سے یہی ابلیس مراد ہوتا ہے۔ درحقیقت ابلیس بھی محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک صاحبِ تشخص ہستی ہے جس طرح ہر انسان ایک صاحبِ تشخص ہستی ہوتا ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۹ ان الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا بلکہ جنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اسی آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وہ کافروں میں سے تھا"۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جنوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعموم "شیاطین" کا لفظ انہی جنوں اور ان کی ذرّیت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے، اور جہاں شیاطین سے مراد انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو وہاں یہی مراد ہوتے ہیں۔

۶۰ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین، یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش (باقی صفحہ ۳۶ پر)

اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے

(بقیہ صفحہ ۳۵) ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کونسا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم و حوا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس چیز کی آزمائش تھی کہ یہ شیطانی ترغیبات کے مقابلہ میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمھارے لیے تمھارے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلہ میں اگر تم اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقام لائق کی، اپنی اس فردوس گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اس طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اُس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمھیں فرمانبرداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

۵۳ ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ ظلم دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے، اولاً خدا کا حق کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے، ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے، مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات

(باقی صفحہ ۳۷ پر)

دشمن[۵۱] ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے۔ اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی[۵۲] جس کو اس کے رب نے قبول کرلیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا[۵۳] اور رحم کرنے والا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶) استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کرکے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ یعنی انسان کا دشمن شیطان، اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمن انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمن شیطان ہونا، تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات وہ پیش کرتا ہے ان سے دھوکا کھاکر آدمی اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقیقتاً دشمنی دوستی میں تبدیل ہوگئی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھاگیا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔

۵۲ یعنی آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماں برداری کی طرف رُجوع کرنا چاہا اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دعا کرسکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرماکر وہ الفاظ بتا دیے۔

توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آگیا، طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگیا، پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہوگئی۔

۵۳ قرآن اس نظریہ کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کن نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہگارانہ زندگی میں مبتلا ہوگیا اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کردیتا ہے اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ (باقی صفحہ ۳۸ پر)

ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ[ک]، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا اندیشہ

(بقیہ صفحہ ۳۷) ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمھیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمھاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمھیں سزا ملتی ہے وہ بھی برائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مترتب ہی ہو کر رہے، بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے، چاہے سزا دیدے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی، اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو، اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹے سے کٹے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم، اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [ک] اس فقرہ کا دوبارہ اعادہ معنی خیز ہے۔ اوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی اس نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے، گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا، نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا نہ ان کی نسل کے دامن پر، اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ خدا کو اپنا اکلوتا بھیج کر نوع انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا، برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ اس کے بعد (باقی حاشیہ صفحہ ۳۹ پر)

نہ ہوگا، اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیاتؓ کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں ؓ گے"۔ ۴ع

(بقیہ صفحہ ۳۸) انھیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضیٰ نہ تھا کہ آدم کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دار العذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اتارے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنت ان کی اصلی جائے قیام نہ تھی۔ وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی، البتہ اس سے پہلے ان کو اُس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا جس کا ذکر اوپر ایک حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ؂ آیات جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔ کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیا علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرماں روائے کائنات کے نمائندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں — ہر جگہ عبارت کے سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں "آیت" کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔

؂ یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ کے "عہد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستہ کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستہ کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کسی انسان کے پاس براہ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں عین بغاوت ہے جس کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

مقالات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(بسلسلہ اشاعت ربیع الاول ۱۳۶۰ھ)

رب

لغوی تحقیق اس لفظ کا مادہ ر ب ب ہے جس کا ابتدائی و اساسی مفہوم پرورش ہے۔ پھر اسی سے تصرف، خبرگیری، اصلاحِ حال اور اتمام و تکمیل کا مفہوم پیدا ہوا۔ پھر اسی بنیاد پر فوقیت، سیادت، مالکیت اور آقائی کے مفہومات اس میں پیدا ہو گئے۔ لغت میں اس کے استعمالات کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) پرورش کرنا، نشوونما دینا، بڑھانا۔ مثلاً ربیب اور ربیبہ پروردہ لڑکے اور لڑکی کو کہتے ہیں، نیز اس بچے کو جو سوتیلے باپ کے گھر پرورش پائے۔ پالنے والی دائی کو بھی ربیبہ کہتے ہیں۔ رابّہ سوتیلی ماں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ماں تو نہیں ہوتی مگر بچے کو پرورش کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے رابّ سوتیلے باپ کو کہتے ہیں۔ مُرَبَّب یا مُرَبّٰی اس دوا کو کہتے ہیں جو محفوظ کر رکھی جائے۔ رَبَّ یَرُبُّ رَبًّا کے معنی اضافہ کرنے، بڑھانے اور تکمیل کو پہنچانے کے ہیں، جیسے رَبَّ النعمۃ۔ یعنی احسان میں اضافہ کیا یا احسان کی حد کر دی۔

(۲) سمیٹنا، جمع کرنا، فراہم کرنا۔ مثلاً کہیں گے فلان یربُّ الناس، یعنی فلاں شخص لوگوں کو جمع کرتا ہے، یا سب لوگ اس شخص پر مجتمع ہوتے ہیں۔ جمع ہونے کی جگہ کو مَرَبّ کہیں گے۔ سمٹنے اور فراہم ہو جانے کو تربُّب کہیں گے۔

(۳) خبرگیری کرنا، اصلاحِ حال کرنا، دیکھ بھال اور کفالت کرنا۔ مثلاً ربَّ ضیعتہٗ کے

معنی ہوں گے فلاں شخص نے اپنی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کی۔ ابوسفیان نے صفوان سے کہا تھا لان یربنی رجل من قریش احب الی من ان یربنی رجل من ھوازن ، یعنی قریش میں سے کوئی شخص مجھے اپنی ربوبیت میں لے لے یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی آدمی ایسا کرے۔ علقمہ بن عبیدہ کا شعر ہے :

فکنت امرأ افضت الیک ربابتی   وقبلک ربتنی فضعت ربوب

یعنی تجھ سے پہلے جو رئیس میرے مربی تھے انھوں نے میری خبرگیری و اصلاح نہ کی، آخرکار اب میری کفالت و ربابت تیرے ہاتھ آئی ہے ۔ فرزدق کہتا ہے :

کانوا کسائلۃ حمقاء اذ حقنت   سلاءھا فی ادیم غیر مربوب

اس شعر میں ادیم غیر مربوب سے مراد وہ چمڑا ہے جو کمایا نہ گیا ہو جسے دباغت دے کر درست نہ کیا گیا ہو۔ فلان یرب صنعتہ عند فلان کے معنی ہوں گے فلاں شخص فلاں کے پاس اپنے پیشہ کا کام کرتا ہے یا اس سے کاریگری کی تربیت حاصل کرتا ہے ۔

(۴) فوقیت ، بالادستی ، سرداری ، حکم چلانا ، تصرف کرنا ۔ مثلاً قد رب فلان قومہ ، یعنی فلاں شخص نے اپنی قوم کو اپنا تابع کرلیا ۔ ربیت القوم ، یعنی میں نے قوم پر حکم چلایا اور بالادست ہوگیا ۔ لبید بن ربیعہ کہتا ہے :

واھلکن یوماً رب کندۃ وابنہ   ورب معد بین خبت وعرعر

یہاں رب کندہ سے مراد کندہ کا سردار ہے جس کا حکم اس قبیلہ میں چلتا تھا ۔ اسی معنی میں نابغہ ذبیانی کا شعر ہے :

تخب الی النعمان حتی تنالہ   فدی لک من رب تلیدی و طارفی

(۵) مالک ہونا ۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا أرب غنم ام

رب ابل ؟ تو بکریوں کا مالک ہے یا اونٹوں کا ؟ اسی معنی میں گھر کے مالک کو رب الدار، اونٹنی کے مالک کو رب الناقہ ، جائداد کے مالک کو رب الضیعہ کہتے ہیں ۔ آقا کے معنی میں بھی رب کا لفظ آتا ہے اور عبد یعنی غلام کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے ۔

غلطی سے رب کے لفظ کو محض پروردگار کے مفہوم تک محدود کرکے رکھ دیا گیا ہے اور ربوبیت کی تعریف میں یہ فقرہ چل پڑا ہے کہ ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام (یعنی ایک چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر پایۂ کمال کو پہنچانا) ، حالانکہ یہ اس لفظ کے وسیع معانی میں سے صرف ایک معنی ہے ۔ اس کی پوری وسعتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ حسب ذیل مفہومات پر حاوی ہے :

۱۔ پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت اور نشو ونما دینے والا ۔

۲۔ کفیل ، خبر گیراں ، دیکھ بھال اور اصلاح حال کا ذمہ دار ۔

۳۔ وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو ، جس پر متفرق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں ۔

۴۔ سید مطاع ، سردار ذی اقتدار ، جس کا حکم چلے ، جس کی فوقیت و بالادستی تسلیم کی جائے ، جس کو تصرف کے اختیارات ہوں ۔

۵۔ مالک ، آقا ۔

قرآن میں لفظ رب کے استعمالات قرآن مجید میں یہ لفظ ان سب معانی میں آیا ہے ۔ کہیں ان میں سے کوئی ایک یا دو معنی مراد ہیں ، کہیں اس سے زائد ، اور کہیں پانچوں معنی اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں ۔ اس بات کو ہم آیات قرآنی سے مختلف مثالیں دے کر واضح کریں گے ۔

پہلے معنی میں :

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اس نے کہا کہ پناہ بخدا ! وہ[1] تو میرا رب ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا
(یوسف ۔ ۳)

---

[1] کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حضرت یوسف عزیز مصر کو اپنا رب فرما رہے ہیں ، جیسا کہ بعض مفسرین کو شبہ ہوا ہے ۔ بلکہ دراصل "وہ" کا اشارہ خدا کی طرف ہے جس کی پناہ انھوں نے مانگی ہے مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ ۔ جب مشار الیہ قریب ہی میں مذکور ہو تو کوئی غیر مذکور مشار الیہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت

دوسرے معنی ہیں جس کے ساتھ پہلے معنی کا تصور بھی کم و بیش شامل ہے:

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (الشعراء - ۵)	تمھارے یہ معبود تو میرے دشمن ہیں بجز رب کائنات کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جو میری رہنمائی کرتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔
وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ. ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (النحل - ۷)	تمھیں جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی حاصل ہوئی ہے، پھر جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم گھبرا کر رجوع کرتے ہو، مگر جب وہ تم پر سے مصیبت ٹال دیتا ہے تو کچھ لوگ تم میں ایسے ہیں جو اپنے رب کے ساتھ (اس

نعمت کی بخشش اور اس مشکل کشائی میں) دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہیں

قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (انعام - ۲۰)	کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ ہر چیز کا رب وہی ہے؟
رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (المزمل - ۱)	وہ مغرب و مشرق کا رب ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، لہٰذا تو اسی کو اپنا وکیل (اپنے سارے معاملات کا کفیل و ذمہ دار) بنا لے۔

تیسرے معنی ہیں:

هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (ہود - ۳)	وہ تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹا کر لے جائے جاؤ گے۔
ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ (الزمر - ۱)	پھر تمھارے رب کی طرف تمھاری واپسی ہے۔
قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا (سبا - ۳)	کہو کہ ہم دونوں فریقوں کو ہمارا رب جمع کرے گا۔
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (انعام - ۴)	زمین میں چلنے والا کوئی جاندار اور ہوا میں اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمھاری ہی طرح کی ایک امت نہ ہو، اور ہم نے اپنے دفتر میں کسی کے اندراج سے کوتاہی نہیں کی ہے، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائیں گے۔

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ (یٰسٓ ۔ ۴)	اور جونہی کہ صور پھونکا گیا وہ سب اپنے ٹھکانوں سے اپنے رب کی طرف نکل پڑیں گے۔

چوتھے معنی میں جس کے ساتھ کم و بیش تیسرے معنی کا تصور بھی موجود ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ ۔ ۵)	انھوں نے اللہ کے بجائے اپنے علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنالیا۔
وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۔ ۷)	اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے

دونوں آیتوں میں ارباب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو قوموں اور گروہوں نے مطلقاً اپنا رہنما و پیشوا مان لیا ہو، جن کے امر و نہی، ضابطہ و قانون، اور تحلیل و تحریم کو بلا کسی بالاتر سند کے تسلیم کیا جاتا ہو، جنھیں بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار سمجھا جاتا ہو۔

اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ..... وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (یوسف ۔ ۵)	یوسفؑ نے کہا کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب کو شراب پلائے گا ...... اور ان دونوں میں سے جس کے متعلق یوسفؑ کا خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسفؑ نے کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا، مگر شیطان نے اسے بھلاوے میں ڈال دیا اور اس کو اپنے رب سے یوسفؑ کا ذکر کرنے کا خیال نہ رہا۔
فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ (یوسف ۔ ۷)	جب پیغام لانے والا یوسفؑ کے پاس آیا تو یوسفؑ نے اس سے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس جا، اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، میرا رب تو ان کی چال سے باخبر ہے ہی۔

ان آیات میں حضرت یوسفؑ نے مصریوں سے خطاب کرتے ہوئے بار بار فرعونِ مصر کو ان کا رب قرار دیا ہے، اس لیے کہ جب وہ اس کی مرکزیت اور اس کا اقتدارِ اعلیٰ اور اس کو امر و نہی کا مالک تسلیم کرتے تھے تو وہی ان کا رب تھا۔ برعکس اس کے خود حضرت یوسفؑ اپنا رب اللہ کو قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ فرعون کو نہیں، صرف اللہ کو مقتدرِ اعلیٰ اور صاحبِ امر و نہی مانتے تھے۔

پانچویں معنی ہیں:

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ۔ (قریش)	لہٰذا انھیں اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے جس نے ان کی رزق رسانی کا انتظام کیا ہے اور انھیں بدامنی سے محفوظ رکھا ہے
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ (صٰفّٰت۔ ۵)	تیرا رب جو عزت و اقتدار کا مالک ہے ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔
فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (انبیاء۔ ۲)	اللہ جو عرش کا مالک ہے ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔
قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (المومنون۔ ۵)	پوچھو کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرش بزرگ کا مالک کون ہے؟
رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ (الصّٰفّٰت۔ ۱)	وہ جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں اور ان سب چیزوں کا جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔
وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرَىٰ (النجم۔ ۳)	اور یہ کہ شعریٰ کا مالک بھی وہی ہے۔

ربوبیت کے باب میں گمراہ قوموں کے تخیلات ان شواہد سے لفظ رب کے معانی بالکل غیر مشتبہ طور پر متعین ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ربوبیت کے متعلق گمراہ قوموں کے وہ کیا تخیلات تھے جن کی تردید کرنے کے لیے قرآن

آیا، اور وہ کیا چیز ہے جس کی طرف قرآن بلاتا ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن گمراہ قوموں کا ذکر قرآن نے کیا ہے اُن کو الگ الگ لے کر ان کے خیالات سے بحث کی جائے تاکہ بات بالکل منقح ہو جائے۔

قوم نوحؑ سب سے پہلی قوم جس کا ذکر قرآن کرتا ہے حضرت نوحؑ کی قوم ہے۔ قرآن کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ حضرت نوحؑ کی دعوت کے جواب میں ان کا یہ قول خود قرآن نے نقل کیا ہے:۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (المومنون۔ ۲)	یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر تم جیسا ایک انسان۔ یہ دراصل تم پر اپنی فضیلت جمانا چاہتا ہے، ورنہ اگر اللہ کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔

انھیں اللہ کے خالق ہونے اور پہلے اور دوسرے معنی میں اس کے رب ہونے سے بھی انکار نہ تھا چنانچہ حضرت نوحؑ جب ان سے کہتے ہیں کہ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ[۱] (ہود۔ ۳) اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا[۲] (نوح۔ ۱) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا وَّاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا[۳] الخ (نوح۔ ۱) تو ان میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ اللہ ہمارا رب نہیں ہے، یا زمین و آسمان کو اور ہم کو اس نے پیدا نہیں کیا ہے، یا زمین و آسمان کا یہ سارا انتظام وہ نہیں کر رہا ہے۔

پھر ان کو اس بات سے بھی انکار نہ تھا کہ اللہ ان کا اِلٰہ ہے، اسی لیے تو حضرت نوحؑ نے ان کے سامنے اپنی

---

[۱] وہ تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔

[۲] اپنے رب سے معافی چاہو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔

[۳] دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کیسے ہفت آسمان تہ برتہ بنائے اور چاند کو ان کے درمیان نور اور سورج کو چراغ بنایا اور تم کو زمین سے پیدا کیا۔

دعوت ان الفاظ میں پیش کی کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے)، ورنہ اگر وہ اللہ کے الٰہ ہونے سے منکر ہوتے تو دعوت کے الفاظ یہ ہوتے کہ اِتَّخِذُوا اللّٰهَ اِلٰهًا (اللہ کو اپنا الٰہ بنالو)

اب سوال یہ ہے کہ ان کے اور حضرت نوح کے درمیان نزاع کس بات پر تھی؟ آیات قرآنی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ بنائے نزاع دو باتیں تھیں :-

ایک یہ کہ حضرت نوح کی تعلیم یہ تھی کہ جو رب العالمین ہے، جسے تم بھی مانتے ہو کہ تمھیں اور تمام کائنات کو اسی نے وجود بخشا ہے اور وہی تمھاری ضروریات کا کفیل ہے، دراصل وہی اکیلا تمھارا الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے، کوئی اور ایسی ہستی نہیں ہے جو تمھاری حاجتیں پوری کرنے والی، مشکلیں آسان کرنے والی، دعائیں سننے اور مدد کو پہنچنے والی ہو، لہٰذا تم اسی کے آگے سر نیاز جھکاؤ :

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ..... وَلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ (اعراف - ۸)	اے برادران قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمھارا الٰہ نہیں ہے ..... مگر میں رب العالمین کی طرف سے پیغامبر ہوں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔

برعکس اس کے وہ لوگ اس بات پر مُصر تھے کہ رب العالمین تو اللہ ضرور ہے مگر دوسرے بھی خدائی کے انتظام میں تھوڑا یا بہت دخل رکھتے ہیں، اور ان سے بھی ہماری حاجتیں وابستہ ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ ہم دوسروں کو بھی الٰہ مانیں گے :

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (نوح - ۲)	ان کے سرداروں اور پیشواؤں نے کہا کہ لوگو اپنے الٰہوں کو نہ چھوڑو، ودّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ صرف اس معنی میں اللہ کو رب مانتے تھے کہ وہ ان کا خالق، زمین و آسمان کا مالک، اور کائنات کا مدبر اعلیٰ ہے، لیکن اس بات کے قائل نہ تھے کہ اخلاق، معاشرت، تمدن،

سیاست اور تمام معاملاتِ زندگی میں بھی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ اسی کا حق ہے، وہی رہنما، وہی قانون ساز، وہی صاحبِ امر و نہی بھی ہے اور اسی کی اطاعت بھی ہونی چاہیے۔ ان سب معاملات میں انھوں نے اپنے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو رب بنا رکھا تھا۔ برعکس اس کے حضرت نوحؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ ربوبیت کے ٹکڑے نہ کرو، تمام مفہومات کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کو رب تسلیم کرو، اور اس کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو قوانین اور جو احکام میں تمھیں پہنچاتا ہوں ان کی پیروی کرو۔

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ (الشعراء۔ ۶)	میں تمھارے لیے خدا کا معتبر رسول ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

قوم عاد قوم نوحؑ کے بعد قرآن عاد کا ذکر کرتا ہے۔ یہ قوم بھی اللہ کی ہستی سے منکر نہ تھی، اس کے الٰہ ہونے سے بھی اس کو انکار نہ تھا، اور جس معنی میں حضرت نوحؑ کی قوم اللہ کو رب تسلیم کرتی تھی اسی معنی میں وہ بھی اللہ کو رب مان رہی تھی، البتہ بنائے نزاع وہی دو امور تھے جو اوپر قوم نوحؑ کے سلسلے میں بیان ہو چکے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی حسبِ ذیل تصریحات اس پر صاف دلالت کرتی ہیں:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا، قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ۔ ۔ ۔ ۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰہَ وَحْدَہٗ وَنَذَرَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (اعراف۔ ۹)	عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ..... انھوں نے جواب دیا کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہم بس اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت باپ دادا کے وقتوں سے ہوتی آ رہی ہے
قَالُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِکَۃً (السجدہ)	انھوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیج سکتا تھا۔
وَتِلْکَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَعَصَوْا رُسُلَہٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (ھود۔ ۵)	اور یہ عاد ہیں جنھوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا، اس کے رسولوں کی اطاعت قبول نہ کی، اور ہر جبار دشمنِ حق کی پیروی اختیار کر لی۔

ثمود | اب ثمود کو لیجیے جو عاد کے بعد سب سے بڑی سرکش قوم تھی۔ اصولاً اس کی گمراہی بھی اسی قسم کی تھی جو قوم نوح اور قوم عاد کی بیان ہوئی ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے سے انکار نہ تھا، اُس کی عبادت سے بھی انکار نہ تھا، بلکہ انکار اس بات سے تھا کہ اللہ ہی الٰہ واحد ہے، صرف وہی عبادت کا مستحق ہے، اور ربوبیت اپنے تمام معانی کے ساتھ اکیلے اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔ وہ اللہ کے سوا دوسروں کو بھی فریاد رس، مشکل کشا اور حاجت روا ماننے پر اصرار کرتے تھے، اور اپنی اخلاقی و تمدنی زندگی میں اللہ کے بجائے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کرنے اور ان سے اپنی زندگی کا قانون لینے پر مُصر تھے۔ یہی چیز بالآخران کے ایک فسادی قوم بن جانے اور مبتلائے عذاب ہونے کی موجب ہوئی۔ اس کی توضیح حسب ذیل آیات سے ہوتی ہے:

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ (السجدہ - ۲)

اے محمد! اگر یہ لوگ تمھاری پیروی سے منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ عاد اور ثمود کو جو سزا ملی تھی ویسی ہی ایک ہولناک سزا سے میں تم کو ڈراتا ہوں جب ان قوموں کے پاس ان کے پیغمبر آگے اور پیچھے سے آئے اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انھوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا تم جو کچھ لے کر آئے ہو اسے ہم نہیں مانتے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ...... قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (ہود - ۶)

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی پرستش و بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے...... انھوں نے کہا صالح! اس سے پہلے تو ہماری بڑی امیدیں تم سے وابستہ تھیں، کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے؟

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ

جب ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا کیا تمھیں اپنے بچاؤ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ...... وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء۔ ۸)

کی کوئی فکر نہیں؟ دیکھو میں تمھارے لیے اللہ کا معتبر رسول ہوں، لہذا اللہ کی ناراضی سے بچو اور میری اطاعت قبول کرو..... اور ان حد سے گذرنے والوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

قوم ابراہیم اور نمرود

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی قوم کا نمبر آتا ہے۔ اس قوم کا معاملہ خاص طور پر اس لیے اہم ہے کہ اس کے بادشاہ نمرود کے متعلق یہ عام غلط فہمی ہے کہ وہ اللہ کا منکر اور خود خدا ہونے کا مدعی تھا، حالانکہ وہ اللہ کی ہستی کا قائل تھا، اس کے خالق ومدبر کائنات ہونے کا معتقد تھا، اور صرف تیسرے، چوتھے اور پانچویں معنی کے اعتبار سے اپنی ربوبیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ نیز یہ بھی عام غلط فہمی ہے کہ یہ قوم اللہ سے بالکل ناواقف تھی اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کی سرے سے قائل ہی نہ تھی، حالانکہ فی الواقع اس قوم کا معاملہ قوم نوح اور عاد اور ثمود سے قطعاً کچھ بھی مختلف نہ تھا۔ وہ اللہ کے وجود کو بھی مانتی تھی، اس کا رب ہونا اور خالق ارض وسما اور مدبر کائنات ہونا بھی اسے معلوم تھا، اس کی عبادت سے بھی وہ منکر نہ تھی، البتہ اس کی گمراہی یہ تھی کہ وہ ربوبیت بمعنی اول ودوم میں اجرام فلکی کو حصہ دار سمجھتی تھی اور اس بنا پر اللہ کے ساتھ ان کو بھی معبود قرار دیتی تھی، اور ربوبیت بمعنی سوم وچہارم وپنجم کے اعتبار سے اس نے اپنے بادشاہوں کو رب بنا رکھا تھا۔ قرآن کی تصریحات اس بارے میں اتنی واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کس طرح لوگ اصل معاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہ گئے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے آغاز ہوش کا وہ واقعہ لیجیے جس میں ان کی تلاش حق کا نقشہ کھینچا گیا ہے:۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ

جب اس پر رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا، کہنے لگا یہ میرا رب ہے، مگر جب وہ تارا ڈوب گیا تو اس نے کہا ڈوبنے والوں کو تو میں پسند نہیں کرتا۔ پھر جب چاند چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی

مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام-۹)

تو خطرہ ہے کہ کہیں میں بھی ان گمراہ لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، یہ تو سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی چھپ گیا تو وہ پکار اٹھا کہ اے برادران قوم جو شرک تم کرتے ہو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے میں نے تو سب طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اس کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

خط کشیدہ فقروں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس سوسائٹی میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھ کھولی تھی اس میں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے کا تصور اور اس ذات کے رب ہونے کا تصور ان سیاروں کی ربوبیت کے تصور سے الگ موجود تھا، اور آخر کیوں نہ موجود ہوتا جبکہ یہ لوگ اُن مسلمانوں کی نسل سے تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے تھے اور ان کی قریبی رشتہ دار وہمسایہ اقوام (عاد و ثمود) میں پے در پے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے دینِ اسلام کی تجدید بھی ہوتی رہی تھی (جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ)۔ پس حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کے فاطر السموات والارض اور رب ہونے کا تصور تو اپنے ماحول سے مل چکا تھا، البتہ جو سوالات ان کے دل میں کھٹکتے تھے وہ یہ تھے کہ نظام ربوبیت میں اللہ کے ساتھ چاند، سورج اور سیاروں کے شریک ہونے کا جو تخیل ان کی قوم میں پایا جاتا ہے اور جس کی بنا پر یہ عبادت میں بھی اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھیرا رہے ہیں، یہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے[۵]۔ چنانچہ نبوت سے پہلے اسی کی جستجو انھوں نے کی

۵؎ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم کے وطن اُر کے متعلق آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں جو انکشافات ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چندرماں دیوتا کی پرستش ہوتی تھی جسے ان کی زبان میں "ننّار" کہا جاتا تھا۔ اور اس کے ہمسایہ علاقہ میں جس کا مرکز لرسہ تھا، سورج دیوتا کی عبادت ہوتی تھی جس کا نام ان کی زبان میں شماش تھا۔ اس ملک کے فرماں روا خاندان کا بانی اُرنمّو تھا جو عرب میں جاکر نمرود ہو گیا، اور اسی کے نام پر وہاں کے فرماں رواؤں کا لقب ہی نمرود قرار پایا جیسے نظام الملک کے جانشین نظام کہلاتے ہیں۔

اور طلوع و غروب کا انتظام ان کے لیے اس امر واقعی تک پہنچنے میں دلیل راہ بن گیا کہ فاطر السموات والارض کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ اسی بنا پر چاند کو غروب ہوتے دیکھ کر وہ فرماتے ہیں کہ "اگر میرے رب (یعنی اللہ) نے میری رہنمائی نہ فرمائی" تو خوف ہے کہ کہیں میں بھی حقیقت تک رسائی پانے سے نہ رہ جاؤں اور ان مظاہر سے دھوکا نہ کھا جاؤں جن سے میرے گرد وپیش لاکھوں انسان دھوکا کھا رہے ہیں۔

پھر جب حضرت ابراہیم نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے اور انھوں نے دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تو جن الفاظ میں وہ اپنی دعوت پیش فرماتے تھے ان پر غور کرنے سے وہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا۔ (انعام۔۹)

اور آخر میں اُن کو کس طرح ڈر سکتا ہوں جنھیں تم اللہ کا شریک ٹھیراتے ہو، جبکہ تم اللہ کے ساتھ اُن کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے الٰہیت و ربوبیت میں شریک ہونے پر اللہ نے تمھارے پاس کوئی سند نہیں بھیجی۔

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مریم۔۳)

تم اللہ کے سوا اور جن جن سے دعائیں مانگتے ہو ان سب سے میں دست کش ہوتا ہوں۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ .... قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (انبیاء۔۵)

کہا تمھارا رب تو صرف آسمانوں اور زمین کا رب ہی ہے جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے .... کہا پھر کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں نفع و نقصان پہنچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے؟

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (صٰفٰت۔۳)

جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ تم کن کی عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کے سوا اپنے خود ساختہ الٰہوں کی بندگی کا ارادہ ہے؟ پھر رب العالمین کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (الممتحنہ-۱)

ابراہیم اور اس کے ساتھی مسلمانوں نے اپنی قوم کے لوگوں سو صاف کہدیا کہ ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو ان سب سے کوئی تعلق نہیں، ہم تمہارے طریقے کو ماننے سے انکار کر چکے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کیلیے بغض و عداوت کی بنا پڑ گئی ہے جب تک کہ تم اکیلے اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

حضرت ابراہیم کے ان تمام ارشادات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مخاطب وہ لوگ نہ تھے جو اللہ سے بالکل ناواقف اور اس کے رب العالمین اور معبود ہونے سے منکر یا خالی الذہن ہوتے، بلکہ وہ لوگ تھے جو اللہ کے ساتھ ربوبیت (بمعنی اول و دوم) اور الہیت میں دوسروں کو شریک قرار دیتے تھے۔ اسی لیے تمام قرآن میں کسی ایک جگہ بھی حضرت ابراہیم کا کوئی ایسا قول موجود نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنی قوم کو اللہ کی ہستی اور اس کے الہ اور رب ہونے کا قائل کرنے کی کوشش کی ہو، بلکہ ہر جگہ وہ دعوت اس چیز کی دیتے ہیں کہ اللہ ہی رب اور الہ ہے۔

اب نمرود کے معاملہ کو لیجیے۔ اس سے حضرت ابراہیم کی جو گفتگو ہوئی اسے قرآن اس طرح نقل کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (بقرہ-۳۵)

تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں بحث کی، اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی و موت ہے، تو اس نے کہا زندگی و موت تو میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیم نے کہا، اچھا تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اب تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر مبہوت رہ گیا۔

اس گفتگو سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جھگڑا اللہ کے ہونے یا نہ ہونے پر نہ تھا بلکہ اس

بات پر تھا کہ ابراہیم علیہ السلام رب کسے تسلیم کرتے ہیں. نمرود اول تو اس قوم سے تعلق رکھتا تھا جو اللہ کی ہستی کو مانتی تھی، دوسرے جب تک کہ وہ بالکل ہی پاگل نہ ہو جاتا وہ ایسی صریح احمقانہ بات کبھی نہ کہہ سکتا تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور سورج اور چاند کو گردش دینے والا وہ خود ہے. پس دراصل اس کا دعویٰ یہ نہ تھا کہ میں اللہ ہوں یا میں رب السمٰوات والارض ہوں، بلکہ اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں اس مملکت کا "رب" ہوں جس کی رعیت کا ایک فرد ابراہیم ہے. اور یہ رب ہونے کا دعویٰ بھی اسے ربوبیت کے پہلے اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے نہ تھا، کیونکہ اس اعتبار سے تو وہ خود چاند اور سورج اور سیاروں کی ربوبیت کا قائل تھا، البتہ وہ تیسرے، چوتھے اور پانچویں مفہوم کے اعتبار سے اپنی مملکت کا رب بنتا تھا، یعنی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں اس ملک کا مالک ہوں، اس کے سارے باشندے میرے بندے ہیں، میرا مرکزی اقتدار ان کے اجتماع کی بنیاد ہے اور میرا فرمان ان کے لیے قانون ہے (اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ کے الفاظ صریحاً اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس کے دعوائے ربوبیت کی بنیاد بادشاہی کے زعم پر تھی)۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کی رعیت میں سے ابراہیم نامی ایک شخص اٹھا ہے جو نہ چاند اور سورج اور سیاروں کی فوق الفطری رُبوبیت کا قائل ہے اور نہ بادشاہِ وقت کی سیاسی و تمدنی ربوبیت تسلیم کرتا ہے تو اس کو تعجب ہوا اور حضرت ابراہیم کو بلا کر اس نے دریافت کیا کہ آخر تم کسے رب مانتے ہو؟ حضرت ابراہیم نے پہلے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی و موت کے اختیارات ہیں. مگر اس جواب سے وہ بات کی تہ کو نہ پہنچ سکا اور یہ کہہ کر اس نے اپنی ربوبیت ثابت کرنی چاہی کہ زندگی اور موت کے اختیارات تو مجھے حاصل ہیں، جسے چاہوں قتل کرا دوں اور جس کی چاہوں جان بخشی کر دوں. تب حضرت ابراہیم نے اسے بتایا کہ میں صرف اللہ کو رب مانتا ہوں، ربوبیت کے جملہ مفہومات کے اعتبار سے میرے نزدیک تنہا اللہ ہی رب ہے. اس نظامِ کائنات میں کسی دوسرے کی ربوبیت کے لیے گنجائش ہی کہاں ہو سکتی ہے جب کہ سورج کے طلوع و غروب پر وہ ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتا. نمرود آدمی ذی ہوش تھا. اس دلیل کو سن کر

اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ فی الواقع اللہ کی اِس سلطنت میں اس کا دعوائے ربوبیت بجز ایک زعم باطل کے اور کچھ نہیں ہے، اسی لیے وہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر نفس پرستی اور شخصی و خاندانی اغراض کی بندگی ایسی دامنگیر ہوئی کہ ظہور حق کے باوجود وہ خود مختارانہ حکمرانی کے منصب سے اُتر کر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر آمادہ نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (مگر اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا) یعنی اس ظہور حق کے بعد جو رویہ اسے اختیار کرنا چاہیے تھا اسے اختیار کرنے کے لیے جب وہ تیار نہ ہوا اور اس نے غاصبانہ فرمانروائی کر کے دنیا پر اور خود اپنے نفس پر ظلم کرنا ہی پسند کیا تو اللہ نے بھی اسے ہدایت کی روشنی عطا نہ کی، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو خود ہدایت کا طالب نہ ہو اس پر زبردستی اپنی ہدایت مسلط کرے۔ (باقی)

ہیگل، مارکس اور اسلامی نظام

باب ششم

اسلامی نظام معیشت

(بسلسلہ اشاعت گذشتہ)

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان تدابیر و قوانین کی وضاحت کریں گے جن سے معلوم ہو گا کہ اسلامی نظام ایسی ٹھوس معاشی بنیادوں پر قائم ہے کہ معاشی حالات کی تبدیلیاں اس پر مشکل اثر انداز ہو سکتی ہیں۔

معاشی زندگی کی اصلاح اور مادی مرفہ الحالی کے حصول کی غرض سے اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) وہ قانونی احکام جن کا نفاذ زیادہ تر اسلامی حکومت کے قیام پر موقوف و منحصر ہے۔

(۲) اخلاقی ہدایات اور معاشرتی ضوابط جو قانونی حیثیت نہیں رکھتے۔

پہلی شق کے تحت اسلام نے (۱) زکوٰۃ فرض کی (۲) فئے اور غنیمت کے اصول وضع کیے۔ (۳) قوانین وراثت میں تبدیلیاں کیں۔ (۴) اکتناز مال کو مٹایا (۵) سود کی ممانعت کی۔ دوسری شق کے تحت اس نے اخلاقی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے انسان کی ذہنیت اور سیرت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالا اور تمدنی ماحول کو درست کیا ہے۔ اس باب میں ہم صرف پہلی شق پر بحث کریں گے اور دوسری شق کے لیے آئندہ باب مختص ہو گا۔

زکوٰۃ زکوٰۃ کی آمدنی مسلمانوں سے وصول کی جاتی ہے۔ ہر مسلمان پر جو صاحب نصاب ہو زکوٰۃ فرض ہے۔ نصاب کی مقدار تقریباً باون روپے ہوتی ہے بشرطیکہ یہ رقم سال بھر تک جمع رہے۔ نیز وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے قرض دار نہ ہو۔ اگر قرض دار ہوگا تو قرض کی مقدار منہا کرنے کے بعد جو رقم بچے گی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس طرح ہر مسلمان پر جو مذکورۂ بالا شرائط کے مطابق نصاب کا مالک ہو، مال کے چالیسویں حصہ کی ادائیگی فرض ہوگی۔ قابلِ زکوٰۃ اموال چار ہیں؛ زرعی پیداوار، مویشی، سونا چاندی، اور تمام اموالِ تجارت زکوٰۃ سالیانہ فرض کی گئی۔ سال میں دو بار فرض نہیں کی گئی۔ سال میں ایک بار سے زیادہ زکوٰۃ فرض کی جاتی تو زکوٰۃ دینے والے زیر بار ہوتے۔ اور اگر سالیانہ کے سوا کوئی اور میقات مقرر کی جاتی تو زکوٰۃ لینے والوں کو ہر پیداوار سے انتفاع کا موقع نہ ملتا اور طویل مدت تک انتظار کرنا پڑتا۔ مقدار زکوٰۃ مختلف اشیاء میں مختلف ہے اور اس میں ان عوامل پر نظر کی گئی ہے جن سے اموالِ زکوٰۃ حاصل ہوتے ہیں۔ جو اموال کم مشقت سے حاصل ہوتے ہیں ان میں مقدار زکوٰۃ زیادہ ہے اور جو اموال زیادہ مشقت سے حاصل ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ کی مقدار کم ہے۔

رکاز وہ مال ہے جو زمین کے اندر ہو اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ اگر زمین کے اندر پیدا ہو تو وہ معدن (Mine) ہے۔ اور اگر کسی شخص نے زمین کے اندر سیم و زر دفن کر دیا ہے تو وہ کنز (Treasure trove) ہے۔ معدن پر خُمس ہے یعنی اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ لے لیا جائے گا۔ اگر کسی شخص کو زمین میں کوئی خزانہ ملے یا وہ کسی چیز کا معدن برآمد کرے تو وہ خزانہ او معدن اُسی کا ہوگا لیکن اس سے خُمس یعنی پانچواں حصہ لے لیا جائے گا۔ زکوٰۃ کی یہ سب سے بڑی مقدار ہے کیونکہ اس کے حاصل کرنے میں محنت او مشقت برداشت کرنی نہیں پڑتی۔

زراعت میں زکوٰۃ کی دو مقداریں ہیں۔ ایسی زمین کی پیداوار جس کی آب پاشی مصنوعی ذرائع مثلاً نہر، تالاب، کنویں وغیرہ سے ہوتی ہو اس کی پیداوار کا بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لیا جائے گا۔ اور جو زمین بارش کے پانی سے تیار ہو اس کی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جائے گا۔ اموالِ تجارت کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے۔

یہ زکوٰۃ کی سب سے کم مقدار ہے کیونکہ تجارت میں سب سے زیادہ محنت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ سونے چاندی پر معدن یا دفینہ سے حاصل ہونے کی صورت میں زکوٰۃ کی مقدار حاصل کردہ مال کا پانچواں حصہ ہے اور خرید وفروخت کی صورت میں تجارتی مال کی حیثیت سے ہو یا کنز کی صورت میں جمع ہو تو چالیسواں حصہ زکوٰۃ دینی ہوگی۔

زکوٰۃ عاملین (Collectors) کو بھی ادا کی جا سکتی ہے جو حکومت کی جانب سے مقرر ہوتے ہیں اور خود براہ راست محتاجوں، مسکینوں اور غریبوں کو بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن اولیٰ یہی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم حکومت اسلامی کے حوالہ کر دی جائے۔

زکوٰۃ کے مصارف متعین کر دیے گئے ہیں۔ یعنی جن مصارف کی صراحت کر دی گئی ہے ان کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم اور کسی مصرف میں نہیں لائی جا سکتی یہ مصارف آٹھ ہیں:- (۱) فقراء (۲) مساکین (۳) عاملین یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والے جن کی تنخواہیں اسی مد سے ادا کی جائیں گی۔ (۴) مولفۃ القلوب یعنی وہ لوگ کہ اسلام کے خلاف جن کے دلوں کی سختی دور کرنے کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت پیش آئے (۵) غلاموں اور قیدیوں کی رہائی (۶) قرض دار لوگ جو خود قرض کے بار سے سبکدوش نہ ہو سکتے ہوں۔ (۷) راہ خدا یعنی اسلامی نظام کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی جدوجہد (۸) نادار مسافروں کی اعانت۔

فقراء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے پاس ابتدائی ضروریات کی تکمیل کا سامان تو ہو لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ مثلاً ایک طالب علم متعدد کتابوں کا مالک ہے جن کی مجموعی قیمت مقررہ نصاب سے زیادہ ہے۔ اب اگر اس طالب علم کے پاس صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی معمولی ضروریات کی تکمیل کر سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں رکھتا ہے تو وہ ان کتابوں کی ملکیت کے باوجود زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ اگر اس کے برعکس یہی کتابیں کسی جاہل ان پڑھ کی ملکیت ہوتیں تو وہ زکوٰۃ کا مستحق نہ قرار پاتا۔ البتہ اگر طالب علم مذکور ہر کتاب یا بیشتر کتابوں کے دو دو نسخے رکھتا ہو اس طرح سے کہ ان زائد نسخوں کی مجموعی قیمت مقررہ نصاب یعنی باون تولہ

سے زیادہ ہو تو ایسے شخص کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ مساکین وہ لوگ ہیں جن کی معاشی حالت فقراء سے بھی زیادہ پست ہو۔ قرض داروں کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ جو شخص قرض دار ہو اس کی کل ملک ابتدائی ضروریات کی تکمیل اور قرضہ کی رقم منہا کرنے کے بعد مقررہ نصاب سے زیادہ نہ ہو۔ ضروریات میں صرف ابتدائی ضروریات شامل ہیں یعنی صرف ایسی ضروریات جن کے پورا نہ ہونے سے زندگی دوبھر ہو جائے۔ خدا کی راہ میں زکوٰۃ صرف کرنے سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ اُن مجاہدین کی ضروریات اور ان مساعی۔ کے مطابق پر صرف کی جائے جو دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے میں مشغول ہوں۔ مجاہد اگر خوش حال بھی ہو تو جہاد کی ضروریات میں صرف کرنے کے لیے وہ زکوٰۃ لینے کا حق دار ہے، کیونکہ جہاد ایک اجتماعی کام ہے اور اجتماعی کاموں کا بار تنہا ایک شخص پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ ایک اور طریقہ خدا کی راہ میں صرف کرنے کا یہ ہے کہ جو لوگ عدمِ استطاعت کے باعث حج کو نہ جا سکتے ہوں ان کی مدد کی جائے۔ اِن آٹھ مصارف کے علاوہ زکوٰۃ کی آمدنی اور کسی مصرف میں نہیں لائی جا سکتی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ زکوٰۃ اس قسم کا کوئی محصول نہیں ہے جو آجکل حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کا ہر محصول کسی نہ کسی شکل میں اُن معاشرتی خدمات (Social Services) کے معاوضہ میں عائد کیا جاتا ہے جو حکومت رعایا کی خاطر انجام دیتی ہے۔ مگر زکوٰۃ وہ محصول ہے جو امراءُ اور صاحبِ استطاعت افراد سے صرف اس لیے وصول کیا جاتا ہے کہ اُس سے غیر مستطیع افراد کی مدد کی جائے۔ موجودہ دَور میں اگر کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کی رعایا زکوٰۃ سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہم سے اتنے محصولات وصول کیے جاتے ہیں لہٰذا حکومت کو انہی محصولات کی آمدنی میں سے غرباء اور مساکین کی مدد کرنی چاہیئے۔ اس کا جواب حکومت یہ دے گی کہ جتنے محصولات تم سے وصول کیے جاتے ہیں ان سب سے تمہاری ذات کو کسی نہ کسی طرح فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔ قیامِ امن، جان و مال کا تحفظ، رسل و رسائل اور آمد و رفت کے وسائل کی ترقیاں انہی محصولات کی آمدنی سے

تکمیل پذیر ہوتی ہیں۔ تعلیم کی اشاعت، طبی امداد کی فراہمی اور دوسری آسائشیں جو تمھیں میسر ہیں اسی روپیہ سے مہیا کی جاتی ہیں۔ لیکن زکوٰۃ تو وہ محصول ہے جو ان فائدوں سے قطع نظر، خدا نے تم پر اس لیے عائد کیا ہے کہ اس سے غرباء اور فقراء فائدہ حاصل کریں۔ اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف متعین ہیں۔ یہاں تک کہ حکومت بھی یہ حق نہیں رکھتی کہ وہ ان مصارف کے علاوہ زکوٰۃ کو کسی اور طرح سے صرف کرے۔

حضور رسالتمآب نے زکوٰۃ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے کہ وہ ایک ایسی رقم ہے جو دولتمند افراد سے لے کر غریبوں کو واپس کر دی جاتی ہے یُؤْخَذُ مِنَ الْاَغْنِیَآءِ وَ یُرَدُّ عَلَی الْفُقَرَآءِ۔ اس حدیث شریف میں یُرَدُّ (واپس کی جاتی ہے) کا استعمال قابل غور ہے۔ اس سے یہ مفہوم صاف مترشح ہوتا ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ غریبوں پر کوئی احسان نہیں کرتے کیونکہ یہ غریبوں کا حق تھا جو انھیں ملنا ہی چاہیے تھا۔ نیز اس فقرہ سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ جو کچھ روپیہ پیسہ تم بطور زکوٰۃ دیتے ہو اس کے متعلق یہ مت خیال کرو کہ وہ ضائع ہو گیا ہے، نہیں، وہ تمھاری جماعت کے اندر ہی رہے گا۔ تم سے لے کر تمھاری جماعت ہی کے افراد کو واپس کیا جاتا ہے۔

تقسیم غنیمت و فے | اجتماعی دولت کو جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم کرنے اور غربت و افلاس کے مٹانے کی غرض سے اسلام نے صرف زکوٰۃ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غنیمت اور فے کی تقسیم میں بھی اس امر کو بدرجۂ اتم ملحوظ رکھا کہ دولت ایک محدود طبقہ میں نہ جمع ہونے پائے۔ غنیمت (Booty) وہ مال ہے جو کفار سے جنگ کے دوران میں حاصل کیا جائے۔ اس کے متعلق قرآن مجید کا حکم ہے:-

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔

تمھیں معلوم ہو کہ جو غنیمت بھی تم پاؤ خواہ کسی قسم کی ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے، رسول کے لیے، رسول کے قرابتداروں کے لیے، یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

یہ حکم ایسے اموال کے بارے میں ہے جو مسلمانوں کو کفار اور اہل شرک کے لشکروں میں ملیں۔

جو ساز و سامان، اسلحہ، جانور وہ ان لوگوں سے چھینیں، اس میں پانچواں حصہ ان کا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے مذکورۂ بالا آیت میں نامزد کر دیا ہے۔ باقی چار حصے غنیمت حاصل کرنے والے لشکر کے درمیان انصاف کے ساتھ تقسیم کر دیے جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ گھوڑے سوار کو تین حصے، ایک حصہ سوار کا اور دو حصے گھوڑے کے، اور پیادہ کو ایک حصہ دیا جاتا تھا۔ غنیمت سے جو خُمس (پانچواں حصہ) نکالا جاتا اس کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی کہ خمس کے پانچ مساوی حصے کیے جاتے۔ اس میں سے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہوتا، ایک ذوی القُربیٰ کا اور باقی تین حصے یتیموں، مسکینوں اور نادار مسافروں کے ہوتے (یتیم وہ ہے جو بالغ نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یتم بعد حلم بالغ ہونے کے بعد یتیم نہیں ہے)۔ ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذوی القربیٰ کا حصہ حذف کر دیا تھا اور خمس کو پانچ کے بجائے تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے، یعنی یتامیٰ، مساکین اور نادار مسافروں کے حصے۔ علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے زمانہ میں خمس کو اسی طور پر تقسیم کیا۔ موجودہ زمانہ میں اگر اسلامی حکومت کے تحت مسلمانوں کو کفار سے مالِ غنیمت حاصل ہو تو اس کا پانچواں حصہ اسی طرح تین حصوں میں تقسیم ہوگا، ایک فقراء اور مساکین کے لیے، ایک یتیموں کے لیے اور ایک نادار مسافروں کے لیے۔ بقیہ ۴/۵ حصہ فوج میں تقسیم کیا جائے گا اور اس کی تقسیم کے طریقہ میں آج کل کے فوجی نظام کے لحاظ سے مناسب تغیر و تبدل کر لیا جائے گا۔

یہ تقسیم بھی اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اسلام نے ہر معاملہ میں غریبوں اور غیر مستطیع افراد کا سب سے زیادہ خیال رکھا ہے اور دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ علاوہ خمس کے جو پورا کا پورا فقراء، مساکین، یتامیٰ اور نادار مسافروں کو ملتا ہے، اہلِ لشکر کے متعلق بھی غالب امکان یہی ہے کہ اس میں غریب اور غیر مستطیع لوگوں کی تعداد مالدار اور صاحبِ استطاعت افراد سے زیادہ ہوگی۔ اس لیے مالِ غنیمت کا بقیہ حصہ بھی زیادہ تر انہی لوگوں کے ہاتھ آتا ہے جن کی معاشی حالت اس کی ضرورت مند

ہے سب سے زیادہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ مال غنیمت ایک ایسا مال ہے جسے سپاہی اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر اور اپنا خون بہا کر حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس مال کا پانچواں حصہ غریبوں کو دلوایا گیا ہے۔ دنیا کے اور کس قانون میں غربا، اور کم استطاعت افراد کا اتنا خیال رکھا گیا ہے؟

معادن (Mines) اور کنوز (Treasure troves) کے متعلق فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ ان پر جو محصول عائد کیا جائے گا اس کی نوعیت زکوٰۃ کی ہوگی یا غنیمت کی۔ امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ معدن اور کنز کا محصول زکوٰۃ کی نوعیت رکھتا ہے یعنی اس کا چالیسواں حصہ وصول کیا جائے گا لیکن امام ابوحنیفہؒ کا اجتہاد یہ ہے کہ اس کی نوعیت مال غنیمت کی ہے اس لیے اس کا پانچواں حصہ وصول کیا جائے گا۔ اور اس کی تقسیم بھی مال غنیمت کے خمس کی طرح ہوگی۔ یعنی محصول سے جو آمدنی ہوگی وہ تین مساوی حصوں میں تقسیم کردی جائے گی، ایک یتیموں کے لیے، ایک فقراء اور مساکین کے لیے اور ایک نادار مسافروں کے لیے۔

فئے کی تعریف میں بھی اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ فئے سے وہ اموال مراد ہیں جو دشمن یا اس کے ملک سے لڑائی ختم ہونے کے بعد پُر امن طریقہ سے حاصل ہوں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ فئے وہ آمدنی ہے جو مفتوحہ ممالک سے حاصل ہو خواہ کسی شکل میں ہو۔ لیکن عام رائے یہ ہے کہ ہر وہ آمدنی فئے ہے جو زکوٰۃ اور غنیمت کے علاوہ اسلامی حکومت کو اور کسی ذریعہ سے حاصل ہو۔ اس طرح خراج، جزیہ وغیرہ فئے میں شامل ہیں۔ فئے کی تقسیم کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ فئے کی جملہ آمدنی عامۃ المسلمین کے فائدہ میں صرف کی جائے گی اور امام کو اختیار ہے کہ جس کام میں اسے مسلمانوں کی فلاح نظر آئے اس میں فئے کی آمدنی کو صرف کرے۔ فوجیوں اور سپاہیوں کی تنخواہیں، قلعوں کی تعمیر، سڑکوں اور شاہراہوں کی مرمت و درستگی، چوکیوں کے قیام، تالابوں اور کنوؤں کی تیاری، علماء، اساتذہ، طلباء اور حکام کے مشاہرے، سب کے لیے فئے کی آمدنی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ امام اس آمدنی کی تقسیم میں کسی خاص طریقہ کا پابند نہیں ہے اِلّا یہ

کہ جو کچھ صرف کیا جائے اس سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو فائدہ پہنچے ۔ لیکن امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ مالِ غنیمت کی طرح فئے کی آمدنی میں سے بھی پانچواں حصہ الگ کر لیا جانا چاہیے اور اس کو بھی اسی طرح تقسیم کرنا چاہیے جیسے مالِ غنیمت کے خمس کو یعنی فقراء مساکین، یتامیٰ اور ابن السبیل کے تین الگ الگ حصے ہونے چاہئیں ۔ اس اجتہاد کی بنیاد کلام مجید کی وہ آیت ہے جس میں اموالِ فئے کا تذکرہ کیا گیا ہے :

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۔

جو کچھ ہاتھ لگا دے اللہ اپنے رسول کے بستیوں والوں سے وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (رسول کے) ناتے والوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور محتاجوں کے لیے تاکہ وہ صرف دولتمندوں کے درمیان گردش نہ کرے ۔

اس آیت میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ اجتماعی کوششوں سے جو کچھ حاصل ہو اس میں صرف دولتمندوں ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ غریبوں، یتیموں اور محتاجوں کا بھی حصہ نہیں دیا جانا چاہیے ۔ اسی لیے اس آمدنی کے مصارف متعین کر دیے گئے ہیں کہ مبادا غریب اور کم حیثیت افراد ان اموال سے محروم رہ جائیں ۔ آیت کا آخری ٹکڑا خصوصاً قابلِ غور ہے "تاکہ وہ صرف دولتمندوں کے درمیان گردش نہ کرے" ۔ کیا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت اس بات کا ہو سکتا ہے کہ اسلام نے معاشی مساوات اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے ہر وہ تدبیر اختیار کی جو کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ نظام اختیار کر سکتا ہے ؟ اور کیا اس آیت کے بعد بھی کسی اشتراکی کو جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کو اُن مذاہب کی سطح پر لانے کی کوشش کرے جو معاشی تبدیلیوں کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ؟ تیرہ سو برس پہلے جب دنیا کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معاشی عدم مساوات اور دولت کا ایک محدود طبقہ میں جمع ہو جانا اخلاق و معاشرت اور تمدن کے لیے پیامِ ہلاکت ہے ، اسلام نے اتنے صاف اور صریح لفظوں میں اپنے اس مقصد کی توضیح کر دی تھی کہ وہ ایک ایسی معاشرت کا قیام چاہتا ہے جس میں اجتماعی جد و جہد کے ثمرات سے غرباء اور یتامیٰ ہمیشہ

از بیش فائدہ اٹھائیں۔

اوپر جو کچھ زکوٰۃ، غنیمت اور فئے کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے اُسے سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے تحت عام انسانوں کی معاشی حالت کیا ہوگی۔ اور یہ کہ اس مملکت میں غربت و افلاس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا امکان کتنا کم ہوگا۔ ذیل میں ہم اسلامی مملکت کی آمدنی کے اس حصہ کی تفصیل پیش کریں گے جو بالکلیہ غریبوں اور یتیموں کے لیے وقف ہوگی اور جس کا کوئی جز کسی دوسرے مصرف میں نہیں لگایا جا سکے گا:

وہ آمدنی جو بالکل غریبوں کے لیے وقف ہو گی

حسب مذہب احناف	حسب مذہب شوافع
(۱) زکوٰۃ کی کل آمدنی	(۱) زکوٰۃ کی کل آمدنی۔
(۲) مال غنیمت کا پانچواں حصہ	(۲) مال غنیمت کا پانچواں حصہ۔
(۳) معادن اور کنوز سے جو محصولات وصول ہوں گے ان کی آمدنی کا پانچواں حصہ۔	(۳) فئے کی آمدنی کا پانچواں حصہ

اگر امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کیا جائے تو آئندہ جو بھی اسلامی مملکت قائم ہوگی اُسے علاوہ زکوٰۃ اور غنیمت کے پانچویں حصہ کے اپنی جملہ آمدنی کا خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہوتی ہو پانچواں حصہ غرباء اور یتیموں کے لیے وقف کرنا ہوگا۔ کیونکہ فئے میں زکوٰۃ اور غنیمت کو چھوڑ کر مملکت کی کل آمدنی شامل ہے۔ مملکت کی کل آمدنی کا پانچواں حصہ بجائے خود ایک ایسی رقم ہوگی جسے متعینہ مصارف میں لگانے کے بعد غربت اور معاشی پستی کا وجود ہی باقی نہ ہوگا۔ اگر حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اختیار کیا جائے جب بھی علاوہ زکوٰۃ اور غنیمت کے معادن اور کنوز پر محصولات سے جو آمدنی ہوگی اس کا پانچواں حصہ غرباء کی ضروریات کے لیئے وقف کرنا ہوگا۔ پھر اگر ضرورت پیش آئے اور صورت حال اس کی متقضی ہو تو علمائے

اسلام یہ حکم دینے کے مجاز ہوں گے کہ دونوں اماموں کے اجتہاد پر عمل کیا جائے۔ یعنی فئے کی آمدنی کا پانچواں حصہ غربا پر صرف کیا جائے اور معادن و کنوز سے جو محصولات وصول ہوں ان کا بھی پانچواں حصہ باصطلاح مارکسیت "پرولتاریہ" کی ضروریات کے لیے وقف کر دیا جائے، کیونکہ بہرحال چاروں اماموں کی رائے حق پر ہے۔

یہ تو وہ آمدنیاں ہیں جو صرف غریبوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے علاوہ مملکت کی آمدنی کا بیشتر حصہ کسی ایک مخصوص طبقہ کی ضروریات پر نہیں صرف کیا جا سکے گا۔ بلکہ اسے صرف ایسے اغراض پر صرف کیا جائے گا جو عامۃ المسلمین کے لیے کسی حیثیت سے فائدہ مند ہوں خواہ اندرونی امن و امان یا بیرونی تحفظ کے لیے خواہ معاشی استحکام اور عام مرفہ الحالی کے لیے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ زمانہ میں مملکت کا دائرۂ عمل بہت زیادہ وسیع ہو چکا ہے۔ زندگی کے وہ شعبے جن سے قدیم زمانہ میں مملکت کو کوئی واسطہ نہ تھا اب براہ راست اس کی ذمہ داری میں آ گئے ہیں۔ تعلیم کی اشاعت، طبی امداد کی فراہمی، مزدوروں کی اقل شرح اجرت کا تعین، ان کے لیے عمر رسیدگی کی پنشن (Old age pension) کا انتظام، کسانوں کی مالی امداد، ان کے قرضوں کی ادائیگی، صحت عامہ کی حفاظت اور اسی نوع کے بیشمار کاموں کی تکمیل جن سے مملکت کو کوئی تعلق نہ تھا، اب بالکلیہ اسی پر موقوف ہیں۔ اسلامی مملکت بھی ان ساری ذمہ داریوں کی حامل ہوگی اور وہ سب کچھ کرے گی جو موجودہ حکومتیں کر رہی ہیں الّا یہ کہ کوئی بات اسلامی احکام کے خلاف ہو۔ ان امور کی سربراہی اور ان ذمہ داریوں کی تکمیل وہ اپنی اس آمدنی سے کرے گی جس کے مصارف متعین نہیں کیے گئے ہیں لیکن آمدنی کے وہ حصے جن کے مصارف متعین کیے جا چکے ہیں اور جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، پھر بھی غربا اور کم استطاعت افراد کی ضروریات کے لیے باقی رہیں گے۔ مثلاً اسلامی مملکت تعلیم عامہ پر جو کچھ صرف کرے گی اس کا کوئی جز زکوٰۃ اور فئے یا غنیمت کے متعینہ پانچویں حصے سے محض اس بنا پر نہیں لیا جا سکے گا کہ تعلیم عامہ سے غریب بھی اسی طرح مستفید ہوتے ہیں جس طرح امیر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ زکوٰۃ اور فئے یا غنیمت کے متعینہ حصے صرف انھیں کاموں میں صرف کیے جائیں گے جن سے تنہا غریبوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آمدنی کے ان ذرائع کا لحاظ کیجیے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یعنی وہ ذرائع جو بالکلیہ غربا کے لیے مخصوص ہوں گے، اور پھر دیانت سے فیصلہ کیجیے کہ اسلامی مملکت میں دولت کیونکر ایک محدود طبقہ میں جمع ہو سکتی ہے یا اس قسم کی معاشی عدم مساوات اسلامی سوسائٹی میں کس طرح بار پا سکتی ہے جو آج سرمایہ داری نظام کا امتیازی وصف ہے۔ (باقی)

اظہارِ حقیقت

از جناب قمر الدین خاں صاحب

فروری ۴۲ء کے "معارف" میں جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے نام کی تصریح کے بغیر مودودی صاحب پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

(۱) "گذارش کی گئی تھی کہ وہ اسلامی حقائق کی تعبیر مصطلحات زمانہ سے کر کے حقیقت کی تغییر نہ کریں... فرمایا کہ تجدید میں مصطلحات زمانہ کی تعبیر سے چارہ نہیں مثلاً اعتراض تھا کہ اسلام کو دین اور مذہب کہنے کے بجائے تحریک کیوں کہا جائے؟ جواب ملا کہ دین اور مذہب کے فرسودہ لفظ اس زمانہ میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اور اپنے لیے مخصوص معنی پیدا کر چکے ہیں اس لیے ایک نئے لفظ تحریک سے اسلام کا پورا نظام زندگی سامنے آجاتا ہے... کیا عجب ہے کہ اسی دلیل سے آگے چل کر صلوٰۃ و صوم و زکوٰۃ و حج کی جگہ بھی نئے مصطلحات زمانہ گھڑنے کی ضرورت پیش آجائے... یہ لفظ (یعنی تحریک) انگریزی لفظ (Movement) کا ترجمہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ذہنی تجویز یا اسکیم جس کو ایک شخص نے یا چند شخصوں نے مل کر سوچا ہو اور اس کو پورے جوش و خروش کے ساتھ کامیاب بنانے کے لیے جد و جہد کی جائے۔ اب فرمائیے کہ اسلام ایک ذہنی تجویز یا اسکیم ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا میں بیٹھ کر سوچا ہو؟... اصل میں عیسائیوں نے اسلام کے ساتھ اس لفظ مومنٹ کا استعمال کیا بدیں معنی کہ نعوذ باللہ یہ محمد (صلعم) کی سوچی ہوئی اور ذہن سے نکالی ہوئی اسکیم تھی جس کو انھوں نے اپنے پرجوش رفقاء کے ساتھ مل کر کامیاب کیا۔"

(۲) "ہمارے متکلم نے کہا ہے کہ خلافت راشدہ پارٹی سٹیٹ تھی اور اسی اصول پر پارٹی کا لیڈر حکومت کا خلیفہ بن گیا۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا انتخاب آج کی نازی فیسسٹ بالشویک یورپین پارٹیز کے اصول پر تیرہ سو برس پہلے ہو چکا تھا۔ پھر وہ پارٹیاں کون تھیں اور لیڈر کون تھے۔ فرض کیجیے کہ حضرت ابوبکرؓ کا آغاز عہد ہے۔ اس وقت کون کون پارٹیاں تھیں جن میں سے ایک پارٹی کامیاب ہو کر یا قوت پا کر برسر عروج آگئی تھی... پھر پارٹی لیڈر کا تخیل اسلامی ہے یا فرنگی؟"

(۳) "ہر زمانہ میں مجدد کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو علم (عقائد) اور عمل (فقہ) کی صحیح صورت، جس پر جہالت کے پردے پڑ گئے ہوں تلقین کرے اور جہالت کے ان تو بر تو پردوں کو اپنے علم و عمل سے چاک کر دے لیکن اس صدی کے مجدد کا اعلان یہ ہے . . . کہ فقہ و کلام کے مسائل میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اور جو کچھ آئندہ لکھوں گا یا کہوں گا اس کی حیثیت امیر جماعت کے فیصلہ کی نہ ہوگی بلکہ میری ذاتی رائے کی ہوگی . . . سوال یہ ہے کہ ہمارے مجدد کی شان تجدید کا ظہور نہ عقائد رائجہ کی تصحیح میں ہوگا نہ اعمال فاسدہ کی اصلاح میں تو پھر اس امیر کی پیروی کس چیز میں ہوگی . . . اور یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عقائد و فقہ میں امام و مجدد کی دو رائیں ہوتی ہیں، ایک ذاتی رائے اور ایک امام کی حیثیت سے۔ ایک کی تقلید مسلمانوں کے لیے ضروری اور دوسری کی نہیں"۔

سید صاحب کے مضمون میں طنز کا جس قدر حصہ ہے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے یہاں ہم صرف اُن غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کریں گے جو مذکورۂ بالا تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

(۱) مودودی صاحب نے یہ کبھی نہیں کہا کہ دین اور مذہب کے الفاظ فرسودہ ہو چکے ہیں اس لیے اُن کے بجائے اسلام کو لفظ تحریک سے تعبیر کرنا چاہیے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے، کہ دین کا مفہوم عموماً لوگوں کے ذہنوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس لفظ کو سن کر ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسا نظام ہے جو دوسرے نظاموں کے تسلط کو مٹا کر خود ان کی جگہ قائم ہونا چاہتا ہے" اس وجہ سے میں اسلام کے لیے دین کے ساتھ تحریک کا لفظ بھی اکثر استعمال کرتا ہوں"۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن بابت رجب شعبان، رمضان ۶۰ھ صفحہ ۹۴-۱۹۳) جو بات کہی گئی تھی اور اس کو جو معنی پہنائے گئے، دونوں کا فرق بالکل ظاہر ہے۔

(۲) ایک مضمون کے لیے ایک زبان میں جو الفاظ بطور اصطلاح استعمال کیے گئے ہوں اسی مضمون کو دوسری زبان میں ادا کرنے کے لیے انہی اصطلاحات کو استعمال کرنا نہ تو قابل عمل ہے، نہ مفید مطلب، اور نہ یہ کوئی شرعی و دینی فریضہ ہے۔ اصل چیز جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جائیں وہ ذہن میں انہی معانی کا تصور پیدا کریں جو اصل اصطلاحات میں مضمر تھے۔ ورنہ اگر اس بات پر اصرار کیا جائے کہ ایک ہی زبان کی اصطلاحات

دنیا بھر میں استعمال کی جائیں خواہ لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں، تو خیالات کی تبلیغ محال ہو جائے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں جب آپ اسلام کی تبلیغ کرنے جائیں گے تو کیا آپ اللہ، رسول، آخرت، ایمان، خلافت، جہاد، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، حدیث، فقہ، تفسیر، دین، عبادت، تقویٰ، الٰہ، رب وغیرہ الفاظ کے ترجمے نہ کریں گے؟ اور کیا اردو اور فارسی میں علماء نے اللہ کے لیے خدا، رسول کے لیے پیغمبر، صلوٰۃ کے لیے نماز، صوم کے لیے روزہ، تقویٰ کے لیے پرہیزگاری کے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں؟

(۳) جس چیز کا الزام جناب سید صاحب نے مودودی صاحب کو دیا ہے عجیب بات یہ ہے کہ اس کا ارتکاب وہ ہمیشہ خود کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ان کی حسب ذیل عبارات ملاحظہ ہوں:

"اس نئی مذہبی درگاہ کا قیام نہ صرف ٹرکی کے لیے بلکہ ساری ترکی تاری نسل میں دوبارہ پیغام محمدی کے احیاء کے لیے ہوگا اور عجب نہیں کہ آئندہ چل کر وہ کسی عظیم الشان اسلامی تحریک کا مرکز بن جائے۔" (معارف۔ مارچ ۴۱ء)

"ایسے نوجوان طبقے بھی موجود ہیں جو خود اسلامی تخیل اور اس کی عالمگیر تحریک کی حقیقت سمجھنے اور زمانہ حال کی زبان میں اس کی تعبیر اور فہم و تفہیم کے لیے بے تاب ہیں... مجلس نظام اسلامی جو چھتاری کمیٹی کی خواہش کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لیے کوشش کر رہی ہے وہ اسی اقتضائے حال کی تعمیل ہے۔" (معارف۔ جون ۴۱ء)

(واضح رہے کہ اس مجلس نظام اسلامی کے صدر جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی خود ہیں)

"موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام کو جدید طرز میں اس طرح پیش کرنا جو دوسری قوموں اور جدید طبقہ کے لیے بھی قابل توجہ ہو ایک مفید خدمت ہے۔" (معارف۔ دسمبر ۴۱ء)

"دنیا آج اپنی نجات کی راہ فسطزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشویزم میں ڈھونڈ رہی ہے حالانکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے اسلام ازم۔" (معارف۔ جنوری ۳۹ء)

سوال یہ ہے کہ یہ اسلامی تخیل، اسلامی تحریک، نظام اسلامی اور اسلام ازم کی اصطلاحیں قرآن و حدیث اور صحابہ و تابعین کے آثار و اقوال میں استعمال ہوئی ہیں یا اب گھڑی گئی ہیں؟ اگر اب گھڑی گئی ہیں تو کیا جب سید صاحب مصطلحات زمانہ سے حقائق کی تعبیر فرماتے ہیں تو ان کی تعبیر سے حقیقت کی تغییر نہیں ہوتی؟

(۴) سید صاحب نے لفظ تحریک کو انگریزی لفظ "مومنٹ" کا ترجمہ قرار دیتے ہوئے اس کی جو تشریح فرمائی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ تحریک اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ "مومنٹ" کے مفہوم میں یہ بات ہرگز داخل نہیں ہے کہ جس تجویز یا اسکیم یا مقصد یا نصب العین کے لیے جدوجہد کی جائے وہ لازماً کسی شخص یا اشخاص کی طبعزاد ہی ہو۔ بلکہ اس لفظ کے مفہوم میں اصل اعتبار جس چیز کا ہے وہ صرف مسلسل جدوجہد ہے جو کسی مقصد کے حصول اور کسی تجویز کی کامیابی کے لیے کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ مقصد اور وہ تجویز خدا کی طرف سے ہو یا انسان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہو۔ انگریزی زبان کے مستند ترین لغت (Oxford English Dictionary) میں اس لفظ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

(A series of actions and endeavours by a body of persons, tending more or less continuously towards some special end.)

"ایک جماعتِ اشخاص کی طرف سے اعمال اور مساعی کا ایک سلسلہ جو کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کم و بیش لگاتار چل رہا ہو۔"

اس تعریف سے یہ سوال بالکل غیر متعلق ہے کہ تحریک کی بنیاد جس مقصد پر ہو وہ ان اشخاص کا اپنا تجویز کردہ ہو یا خدا کا مقرر کردہ۔ تحریکیں دونوں طرح کی ہو سکتی ہیں، اور دونوں پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے بشرطیکہ ان میں مسلسل سعی و جہد کا وصف پایا جائے۔ مذہب و مسلک کو جو چیز تحریک سے ممیز کرتی ہے وہ یہی جدوجہد کا وصف ہے۔ جب تک آپ کوئی تخیل یا طریق فکر و عمل اپنے ذہن میں رکھتے ہیں یا خود اس کا اتباع کرتے ہیں، وہ آپ کا مذہب و مسلک ہے۔ جب آپ اس کی تبلیغ کرتے ہیں، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور اس کی اقامت کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنے لگتے ہیں تو اسی چیز کا نام "تحریک" ہے۔

(۵) لیکن اگر لفظ تحریک کا مفہوم وہی مان لیا جائے جو سید صاحب بیان فرماتے ہیں تو ہم ان سے دریافت کریں گے کہ حسب ذیل عبارات کا کیا مفہوم ہے جو خود انہی کے قلم مبارک سے نکلی ہیں:

"تیرھویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا، مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی" (مقدمہ سیرت سید احمد شہید۔ طبع دوم)

"جو کامیابی مولانا اسماعیل شہید کی تحریک کو حاصل ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی ذہنی وعملی قوی کے بیدار کرنے میں جو عظیم الشان کام کیا اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ وہ تجدید اسلام کے اصل واساس، نظام حقیقی کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی تھی"۔ (مقالہ "ایمان")

سوال یہ ہے کہ اگر تحریک سے "مراد کوئی ذہنی تجویز یا اسکیم" ہے "جس کو ایک شخص یا چند اشخاص نے مل کر سوچا ہو" تو حضرت سید احمد اور مولانا اسماعیل رحمہما اللہ کے کام کو آپ "تحریک" کے لفظ سے کس طرح تعبیر فرما سکتے ہیں؟ اور اگر ان کا کام اسی معنی میں آپ کے نزدیک "تحریک" تھا تو اسے تجدید دین اور تجدید اسلام کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۶) عیسائیوں نے اسلام کے لیے لفظ "مومنٹ" کا استعمال اگر کیا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔ البتہ قابل اعتراض جو بات ہے وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے اسے ایک الٰہی تحریک کے بجائے ایک انسان کی طبعزاد تحریک قرار دیا۔

(۷) "پارٹی" کا لفظ انگریزی زبان میں "جماعت" اور "حزب" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور "لیڈر" کا مفہوم وہی ہے جو عربی میں "امام" یا "امیر" کا ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ "امام جماعت" یا "امیر جماعت" کا تخیل تو خالص اسلامی ہو، مگر عربی کے بجائے انگریزی میں "پارٹی لیڈر" کہہ دیا جائے تو محض الفاظ بدل جانے سے وہی تخیل فرنگی ہو جائے۔

(۸) خلافت راشدہ کو "پارٹی اسٹیٹ" اس معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ قومی حکومت (نیشنل اسٹیٹ) یا شاہی حکومت (امپیریل اسٹیٹ) نہ تھی بلکہ اُس جماعت کی حکومت تھی جو اسلام کے عقیدہ ومسلک پر مبنی تھی۔ یہ لفظ دو اصطلاحی الفاظ سے مرکب ہے جن کی تشریح ذیل میں کی جاتی ہے۔

"پارٹی" کا اصل مفہوم صرف یہ ہے کہ کسی نظریہ اور مقصد پر کچھ لوگ متفق ہو کر ایک نظام میں منضبط ہو جائیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ مختلف قسم کی پارٹیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک قسم کی پارٹیاں وہ ہوتی ہیں جن کے پیش نظر پوری زندگی کا جامع مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ جزوی مسائل میں سے کوئی ایک مسئلہ یا مسائل جزئیہ کا ایک

مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ اسیاسات میں اس طرح کی پارٹیاں اسٹیٹ نہیں بناتیں بلکہ اسٹیٹ کے اندر گورنمنٹ کا نظام اپنے اصول پر چلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اجتماعیات میں اس نوع کی پارٹیاں کسی تمدن کی تشکیل نہیں کرتیں بلکہ حاضر الوقت تمدن کے اندر کسی خاص پہلو میں اپنے نقطۂ نظر سے اصلاح یا ترمیم کی کوشش کرتی ہیں۔ (سید صاحب کا ذہن پارٹی کے لفظ سے اسی نوع کی پارٹیوں کی طرف منتقل ہوگیا ہے)۔ دوسری قسم کی پارٹیاں وہ ہوتی ہیں جو اسٹیٹ کے اندر گورنمنٹ نہیں چلاتیں بلکہ خود اپنا اسٹیٹ بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ تمدن کے اندر جزوی اصلاح نہیں کرنا چاہتیں بلکہ خود اپنے اصول پر پورا نظام تمدن بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اس نوع کی پارٹی ایک ایسا نظریہ لے کر اُٹھتی ہے جو اس کے عقیدہ میں تمام مسائل حیات پر حاوی ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع نظام فکر و عمل کی بنیاد بن سکتا ہے۔ یہ پارٹی کوشش کرتی ہے کہ دنیا میں اُسی کے نظریہ اور اُسی کے نظام کی فرمانروائی قائم ہو اور دوسرے ہر نظریہ و نظام کی حکمرانی ختم ہو جائے۔ کمیونسٹ، نازی اور فاشسٹ پارٹیاں اسی دوسرے معنی میں پارٹیاں کہلاتی ہیں، اور قرآن و حدیث میں مسلمانوں کے لیے حزب، جماعت اور امت کے الفاظ بھی اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ مودودی صاحب نے پارٹی کے لفظ سے یہی دوسری قسم کی پارٹی مراد لی ہے نہ کہ وہ جو سید صاحب سمجھے ہیں۔)

لفظ "اسٹیٹ" کا مفہوم آج کل کی اصطلاح میں حکومت کے اس تصور سے بہت زیادہ وسیع و ہمہ گیر ہے جو کچھ مدت پہلے تک سمجھا جاتا رہا ہے۔ اب اسٹیٹ اپنے جغرافی حدود میں پوری انسانی زندگی پر بالکلیہ محیط ہوتا ہے، اس کی بنیاد خود اپنے تصور کائنات و انسان اور فلسفۂ زندگی پر ہوتی ہے، اس تصور کی بنا پر اخلاق، سیاست، معیشت، معاشرت، حقوق و فرائض اور حدود حلال و حرام کا ایک مکمل ضابطہ بنتا ہے جسے اسٹیٹ نافذ کرتا ہے اور ہر شخص جو اس کے حدود میں رہتا ہو، طوعاً و کرہاً اسی کے ضابطہ کی پیروی کرتا ہے۔ افراد یا جماعتوں کے لیے اس نظام کے اندر صرف اُس قدر آزادی ہوتی ہے جس کے لیے خود اسٹیٹ نے گنجائش رکھ دی ہو۔

ان دونوں اصطلاحوں کو ملا کر پارٹی اسٹیٹ کی اصطلاح ایسے اسٹیٹ کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس کو

ایک نظامِ فکر و عمل (آیڈیالوجی) پر ایمان لانے والی جماعت قائم کرے اور چلائے۔ اس تشریح سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے لیے "پارٹی اسٹیٹ" کا لفظ کس قدر صحیح ہے۔ سید صاحب نے اسے محدود معنی میں "پارٹی گورنمنٹ" سمجھ لیا اس وجہ سے وہ سوالات پیدا ہو گئے جو ان کی عبارت سے نقل کیے گئے ہیں۔

(۹) سید صاحب کو ابھی تک اس بات پر اصرار ہے کہ مودودی صاحب "مجدد" ہونے کے مدعی ہیں، حالانکہ مودودی صاحب صاف الفاظ میں اس کی تردید کر چکے ہیں۔ یہ عجیب روش ہے کہ ایک شخص انکار کر رہا ہے کہ میں مدعی نہیں ہوں اور آپ اصرار کیے چلے جاتے ہیں کہ نہیں، تو ضرور مدعی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی شخص کو بدنام کرنے کے لیے اس سے زیادہ سستا نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس پر کسی دعوے کا الزام لگا دیا جائے، مگر "سیرۃ النبی" کے مصنف کو ہم ایسی باتوں سے بالاتر دیکھنا چاہتے تھے۔

(۱۰) سید صاحب کا آخری اعتراض حیرت انگیز ہے۔ مودودی صاحب پر ان کو یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے فقہی و اعتقادی مسائل میں اپنی تحقیق کو تمام ارکانِ جماعت پر مسلط کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ اگر کہیں مودودی صاحب یہ حرکت کر بیٹھے ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ سب سے پہلے سید صاحب ہی اس پر معترض ہوتے کہ اس شخص نے اپنا ایک مستقل مذہب بنا لیا ہے اور یہ جماعت دراصل اس کے مذہب کا متبع فرقہ ہے۔ رہا سید صاحب کا یہ ارشاد کہ اگر تمہارا کام نہ عقائد رائجہ کی تصحیح ہے نہ اعمالِ فاسدہ کی اصلاح تو آخر تمہارا کام کیا ہے، اور یہ ذاتی رائے اور امام کی رائے کا فرق تم نے کہاں سے نکالا ہے، تو اس باب میں جماعت کا مسلک اس قدر واضح کر دیا گیا ہے کہ اس میں سید صاحب جیسے فاضل بزرگ کے لیے کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ جماعت کی بنیاد اصل دین اور اس کے اساسی عقائد اور اس کے نصب العین پر ہے جن میں اہلِ ایمان کے درمیان سلف سے خلف تک کبھی اختلاف نہیں رہا۔ باقی رہے جزئیاتِ فقہ اور اعتقادیات کے فروعی مسائل، تو ان میں تعبیر و تحقیق کی گنجائش صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور علمائے متاخرین سب کے ہاں رہی ہے اور جماعتِ اسلامی کے نظام میں کبھی یہ ضروری نہیں رہا کہ ایک شخص جب امیر یا امام بنا دیا جائے تو تمام جزئی و فروعی مسائل میں اس کی رائے کو تمام مسلمان تسلیم کر لیں۔ بلاشبہ ہم عقائدِ فاسدہ اور اعمالِ فاسدہ کی اصلاح چاہتے ہیں مگر ان الفاظ کا اطلاق صرف ان عقائد و اعمال پر ہوتا ہے جو نصوصِ صریحہ کے خلاف ہوں۔ مجتہد فیہ مسائل میں جن مختلف آرا اور طریقوں کے لیے خود نصوص میں گنجائش ہوں ان میں سے کسی کے لیے یہ الفاظ نہ استعمال کیے جا سکتے ہیں اور نہ کسی امیر یا امام کو یہ حق ہے کہ ان امور میں اپنے مسلک کے سوا باقی سب مسالک کو فاسد قرار دے۔

فہرست مضامین

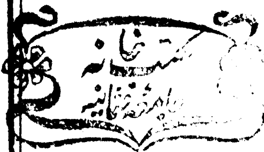
صفر سنہ ۶۱ھ (اپریل سنہ ۴۲ء) جلد ۲۰ عدد ۲-

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک

پریس سرکلر روڈ میں طبع ہوکر دفتر ترجمان القرآن،

پونچھ روڈ، مبارک پارک لاہور سے

شائع ہوا



بسم اللہ الرحمن الرحیمؕ

اشارات

توفیق الٰہی کے اعتماد پر تفہیم القرآن کا جو سلسلہ ان صفحات میں شروع کیا گیا ہے اس کی تکمیل کے بعد ارادہ ہے کہ ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا جائے جس میں ایک عام ناظر کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر اُن تمام امور کی توضیح کر دی جائے جن کا جاننا قرآن مجید کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس دوران میں کہ یہ مسودہ رسالہ میں شائع ہو رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ قرآن کے مبادی پر بھی مختصر اشارات ساتھ ساتھ کیے جاتے رہیں تاکہ جو اصحاب اس مسودہ کو بغرض استفادہ دیکھ رہے ہوں ان کے لیے فہم قرآن کی راہ صاف ہوتی رہے، اور ان سوالات کا جواب ساتھ ساتھ ملتا جائے جو کلام اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بالعموم ناظرین کے ذہن میں کھٹکتے ہیں۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک اجنبی رہا ہے پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا، پھر اصل مضمون کو ابواب و فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ پر بحث کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبہ کو لے کر اس کے متعلق بھی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں

اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں، ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے، ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آجاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رُخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے، بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں، تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ وما بعد الطبیعیات ہے تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں، انسان اور موجوداتِ عالم کا ذکر ہے تو تعلیم طبیعیات کے طریقہ پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو علومِ عمران کے طرز پر نہیں، قانونی احکام اور اُصولِ قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، اور اخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اخلاق کے سارے لٹریچر سے اس کا انداز جدا۔ یہ سب کچھ اپنے سابق کتابی تصور کے خلاف پاکر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مرتب، غیر مربوط، منتشر کلام ہے جو اول سے لے کر آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شذرات پر مشتمل ہے مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بنا رکھ دیتا ہے۔ اور موافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنی کی طرف سے آنکھیں بند کرکے شکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کرکے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقہ سے ربط تلاش کرکے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی "نظریۂ شذرات" کو قبول کر لیتا ہے جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایسی معنی آفرینیوں کی آماج گاہ بن جاتی ہے جو قائل کے منشا کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے اندازِ بیان سے واقفیت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصوص طرزِ تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں ان میں یہ چیزیں بآسانی مل جاتی ہیں اس لیے ان کے مضامین کی تہہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اُس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دوسری کتابوں میں انھیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی ذہنیت لیے جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع، مدعا اور مرکزی مضمون کا سراغ نہیں ملتا، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اسے کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا ہے، اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پس منظر بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی روح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علمِ کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نکات و فوائد پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کر کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہمِ کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انھیں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب اُن پر نہیں کھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نورِ حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاقِ عبارت میں بالکل بے جوڑ محسوس ہوتی ہیں، متعدد مقامات پر تعبیرات اور اسلوبِ بیان کی ناواقفیت انھیں اصل مطلب سے ہٹا کر کسی اور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے، اس کے نزول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے، اس کا موضوع گفتگو کیا ہے، اس کی ساری بحث کس مدعا کے لیے ہے، کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النوع مضامین وابستہ ہیں، کیا طرز استدلال اور کیا طرز بیان اس نے اپنے مدعا کے لیے اختیار کیا ہے، یہ اور ایسے ہی دوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقہ سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدبر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ عام لوگوں کی مقدرت سے یہ بات خارج ہے کہ وہ برسوں کے غائر مطالعہ اور تلاش و تجسس سے ان سوالات کا جواب خود حاصل کریں۔ دراصل یہ قرآن کے شارحین و مفسرین کا کام ہے کہ وہ اس کتاب پاک کا مطالعہ کرنے والوں کی مشکلات کو سمجھیں اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کریں۔ اب تک زیادہ تر توجہ یا تو ان لوگوں کے مقابلہ پر صرف کی گئی ہے جو قرآن کو مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے شبہات و اعتراضات سے نورِ حق کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یا پھر اُن لوگوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو پہلے سے ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اب وہ لوگ ہماری توجہ کے زیادہ مستحق ہیں جو کسی مخالفانہ جذبہ کے بغیر کھلے دل سے قرآن پڑھنے کے لیے تیار ہیں مگر اسے سمجھ کر ایمان اور علم حق کی روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ انھیں بہت زیادہ علمی پیچیدگیوں اور محققانہ گہرائیوں کی حاجت نہیں، عام فہم طریقے سے چند مبادی ان کے ذہن نشین کر دینے کی ضرورت ہے تاکہ آگے چل کر انھیں قرآن کے مطالعہ میں کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے، اس کی پریشانی کی اصل وجہ وہی ابتدائی غلط فہمی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس نے اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کیا کہ وہ "مذہب کے موضوع پر ایک کتاب" پڑھنے چلا ہے۔ "مذہب کا موضوع" اور "کتاب"، ان دونوں کا تصور اس کے ذہن میں وہی تھا جو بالعموم "مذہب" اور "کتاب" کے متعلق ذہنوں میں ہوتا ہے۔ مگر جب

وہاں اسے اپنے ذہنی تصور سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پڑا تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہ کر سکا اور سر رشتہ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث اس نے بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیا جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے بچانے کے لیے اسے پہلے ہی یہ بتا دینا چاہیے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی "تصنیف" دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمھارے ذہن کا وہ کتابی سانچہ جو اب تک کی کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کرے گا بلکہ اُلٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خصوصیات سے تناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہو جانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اُس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

اللہ عزوجل نے، جو کائنات کا خالق اور مالک و فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اِس حصہ میں جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا، اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں، فجور اور تقویٰ کی تمیز دی، انتخاب اور ارادے کی آزادی دی، تصرف کے اختیارات بخشے، اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (اٹانومی) دے کر اسے زمین میں خلیفہ بنایا۔ اِس تقرر کے ساتھ ہی اللہ نے انسان کو آگاہ کر دیا کہ تمھارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں، میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمھاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے، دنیا کی یہ زندگی جس میں تمھیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے درحقیقت تمھارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمھیں میرے پاس واپس

آنا ہوگا اور میں تمھارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام، تمھارے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد رب و الٰہ تسلیم کرو، جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلہ میں کامیاب ہونا ہے، اس کے برعکس تمھارے لیے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو، اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمھیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمھیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے، اور اگر دوسرے کسی رویہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد و بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گذر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔ یہ فہمائش کر کے اللہ نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور انسان اول کو وہ ہدایت بھی دیدی جس کے مطابق اس نوع کو زمین میں کام کرنا چاہیے تھا۔ مگر رفتہ رفتہ انسان اس ہدایت سے منحرف ہوگئے، صحیح رویہ کو چھوڑ کر غلط رویوں پر چل پڑے، یہاں تک کہ جو ہدایت دی گئی تھی اُسے بھی انھوں نے یا تو اپنی غفلت و بے پروائی سے گم کر دیا یا شرارت سے مسخ کر کے اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا۔ اس کے بعد اللہ مختلف قوموں اور ملکوں میں بار بار اپنے پیغمبر بھیجتا رہا جن کا کام یہ تھا کہ صحیح رویہ کی طرف انسانوں کو دعوت دیں، جس ہدایت کو انسانوں نے گم یا مسخ کر دیا ہے اُسے پھر اصلی صورت میں پیش کریں، اور انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے خدائی ہدایت کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہوں انھیں منظم کر کے ایسی امت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانون الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی بند کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ یہ پیغمبر ہزار ہا برس تک دنیا میں آتے رہے، وہی ایک دعوت اور وہی ایک ہدایت پیش کرتے رہے اور اگر انسانوں کے کسی گروہ نے ان کی دعوت قبول کی تو خدا کے مطیع فرمان (مسلم) بندوں کی وہی ایک امت بناتے رہے۔ مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے تو اس دعوت کو قبول ہی نہ کیا اور جنھوں نے

قبول کر کے امتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے حتی کہ ان میں سے بعض امتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔ آخر کار اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیا آتے رہے تھے۔ عام انسان اور پچھلے انبیاء کی بگڑی ہوئی امتیں، سب آپ کے مخاطب تھے[۱]، سب کو صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا، سب کو از سرِ نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں انھیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے ــــ اسی دعوت و ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے لیے اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ نہ یہ گم ہو سکتی ہے اور نہ مسخ کی جا سکتی ہے۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مدعا کیا ہے۔

اس کا موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔

اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور حیاتِ دنیوی کے مآل و انجام کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں اور ان کی بنا پر جو رویے اختیار کیے ہیں وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجہ کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جسے اوپر "صحیح رویہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[۱] اگرچہ مخاطب جن بھی ہیں مگر وہ بالتبع مخاطب ہیں۔ اصل مخاطب انسان ہی ہے۔

اس کا مدعا انسان کو صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اُس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

ان تین بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اُسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان کی ساخت، انسان کی خلقت، آثار کائنات کے مشاہدات، گذری ہوئی قوموں کے واقعات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح، اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر کرتا ہے مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبیعات یا تاریخ یا فلسفہ یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقتِ نفس الامری کے متعلق مختلف انسانی گروہوں کے تصورات کی تردید کرکے اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، اور خلافِ حقیقت رویہ کی غلطی و بدانجامی واضح کرکے اُس رویہ کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اس حد تک اور اس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ "دعوت" کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرز بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس کی کیفیتِ نزول کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یک وقت اسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیا ہو اور کہدیا ہو کہ اسے شائع کرکے لوگوں کو ایک خاص رویۂ زندگی کی طرف بلائیں۔ نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں تجریدی [illegible] طریقہ پر موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی

ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اسلوب۔ دراصل اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اُسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں: ایک پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں۔ دوسرے، حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گردو پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے ان کا رویہ غلط ہو رہا تھا۔ تیسرے، صحیح رویہ کی طرف دعوت اور ہدایت الٰہی کے ان بنیادی اصولِ اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح و سعادت ہے۔ شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائی دعوت کی مناسبت سے بہت چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں، نہایت پُر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے تھی تاکہ دلوں میں یہ بول تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنم کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوں، اور زبانیں ان کے حسن تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انھیں دہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جارہی تھیں عالمگیر صداقتیں مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی جاتی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انہی کی تاریخ، انہی کی روایات، انہی کے روزمرہ مشاہدہ میں آنے والے آثار، انہی کی اعتقادی اور اجتماعی و اخلاقی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

یہ دعوت جو ابتدائی مرحلہ میں دی گئی تھی اس کا ردعمل تین صورتوں میں ظاہر ہوا۔ (۱) چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے امتِ مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔ (۲) ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقہ کی محبت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔ (۳) مکہ اور قریش کی حدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقہ میں پہنچنے لگی۔ یہاں سے اس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

اس مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نہایت پُرجوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کیے جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انھیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی گئی، انھیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جد و جہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا شدید جوش و ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ دوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو پچھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے۔ تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں ان کا گذر ہوتا تھا، آثارِ کائنات اور خود ان کی اپنی ہستی سے ان کے نظریات و عقائد کی غلطی اور توحید و معاد اور حساب آخرت کی صداقت انھیں سمجھائی گئی، خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، برے اخلاق اور غلط طرزِ زندگی پر انھیں ملامت کی گئی اور بتدریج اللہ کی ہدایت اور صحیح رویۂ زندگی کو زیادہ تفصیلی صورت میں ان کے سامنے پیش کر کے قبول حق کی دعوت دی گئی۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جد و جہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوع بڑھتا گیا۔

اس کے بعد یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی جس کا آغاز ہجرت سے ہوا۔ اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ امتِ مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی، پرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے جنگ کی نوبت آئی، پچھلے

انبیاء کی امتوں سے سابقہ پیش آیا۔ خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگیں ہوگیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ اس مرحلہ کی بھی مختلف منزلیں تھیں۔ ہر منزل میں اس کی خصوصی ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات آئے جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا، اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں نبی کو بتایا گیا کہ وہ جماعت اور ریاست اور مدنیت صالحہ کی تعمیر کس طرح کریں، زندگی کے مختلف شعبوں کو کن اصول و ضوابط پر قائم کریں، منافقین اور اہل کتاب اور برسر جنگ یا برسر مسالمت کافروں کے ساتھ ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے کیا معاملہ کریں، اور ایک طرف عالمگیر دعوت اصلاح کی، دوسری طرف جماعت مسلمین کے سردار کی، اور تیسری طرف رئیس حکومت کی مختلف حیثیتوں میں بیک وقت کس طرح کام کریں۔ مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تفصیلی ہدایت دی گئی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی گئی، ان کو راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر ابھارا گیا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت و راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کی تعلیم دی گئی، اور انھیں اس طرح تیار کیا گیا کہ وہ نبی کے بعد ان کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دائرۂ ایمان سے باہر جو لوگ تھے، اہل کتاب، منافق، کفار و مشرکین، ان سب کو ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت و نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی گئی تاکہ ان پر حجت تمام کردی جائے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک ۲۳ سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گذرتی رہی ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں

تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی۔ پھر اس دعوت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصے نازل ہوئے وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے تھے بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے[۵]، اس لیے ان کا اسلوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اسلوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لکچروں کی سی نہیں، بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلہ میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے، ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش و عزم پیدا کرنا، دشمنوں کو دوست اور منکروں کو معترف بنانا، مخالفین کی حجت منقطع کرنا اور ان کی اخلاقی طاقت کا استیصال کر دینا، غرض وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک تحریک کے لیڈر کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اپنے پیغمبر پر جو پیغامات القا کیے ان کا طرز خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسب حال ہوتا ہے، ان میں یونیورسٹی کے لکچروں کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی بکثرت تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں، اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے ہی کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے بلکہ اسی مرحلے کی باتوں کا اعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جائے تو کان انھیں سنتے سنتے تھک جائیں اور طبیعتیں اکتانے لگیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انھیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اسلوب، اور نئی آن بان سے کہا جائے تاکہ نہایت خوشگوار طریقہ سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اس طریقہ سے مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی اساس جن چیزوں پر ہو انھیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظروں

[۵] اگرچہ قلمبند اسی وقت کر لیے جاتے تھے مگر اشاعت زیادہ تر تحریری نہیں بلکہ زبانی ہوتی تھی۔

سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان کا اعادہ بہرحال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سورتیں نازل ہوئی ہیں ان سب میں بالعموم ایک ہی قسم کے مضامین الفاظ اور اندازِ بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفاتِ الٰہی، آخرت اور حساب و مکافات، رسالت و ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکل اور اسی قسم کے دوسرے بنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی ان سے ذہول گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بنیادی تصورات اگر کہیں ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو تحریک اپنی صحیح روح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اُسی ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مرتب کر دیا جس ترتیب سے وہ نازل ہوا تھا۔ اوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کا نزول اُس ترتیب سے ہوا تھا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور اس کا ارتقاء ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ دعوت کے تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد وہ ترتیب کسی طرح درست نہ ہو سکتی تھی جو صرف ارتقاءِ دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ ان پیغامات کو مستقل کتاب کی صورت میں مرتب کرنے کے لیے ایک دوسری ترتیب درکار تھی جو تکمیلِ دعوت کے بعد کی صورتِ حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ ابتدا میں اس دعوت کے مخاطبِ اول وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناآشنائے محض تھے اور وہاں بالکل ابتدا سے کام کرنا تھا مگر تکمیلِ دعوت کے بعد اس کے مخاطبِ اول وہ لوگ ہو گئے جو اس پر ایمان لا کر ایک امت بن چکے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے ذمہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبر نے تمام نظری اور عملی حیثیات سے مکمل کر کے اُن کے سپرد کیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ پہلے وہ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانینِ حیات سے، اور اُن فتنوں سے جو پیغمبروں کی امتوں میں رونما ہوتے رہے ہیں، اچھی طرح واقف اور خبردار ہو جائیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت اور اس کے راستہ کی طرف دعوت کو لے کر آگے بڑھیں۔ یہی حکمت قرآن کی موجودہ ترتیب میں ملحوظ ہے جو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایجاد نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے دی گئی ہے جس نے قرآن نازل کیا ہے۔

تفہیم القرآن

(۳)

البقرہ

(از رکوع ۵ تا رکوع ۱۴)

اے بنی اسرائیل[1]! میری اُس نعمت کا خیال کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ

---

[1] اسرائیل حضرت یعقوب کا نام تھا جو حضرت اسحاق کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے تھے۔ اس نام کا لفظی ترجمہ "عبداللہ" یا "بندۂ خدا" یا "الیشوردس" ہے۔ بنی اسرائیل انھی کی نسل سے ہیں۔ پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکین عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے اُن لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسب ذیل باتوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے:

اولاً، اس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کی اُمت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر و صلاح کا عنصر موجود ہے انھیں اُس صداقت پر ایمان لانے اور اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کو لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبی وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمہارے انبیاء اور تمہارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو در کنار، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمہاری تاریخ اور تمہاری قوم کی موجودہ اخلاقی (باقی صفحہ ۸۸ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷) دینی حالت خود تمہارے بگاڑ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے، تمہاری اپنی چیز ہے۔ لہٰذا جانتے بوجھتے حق کی مخالفت نہ کرو بلکہ اسے قبول کرلو اور جو کام تمہارے کرنے کا تھا، مگر تم نے نہ کیا، اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اٹھے ہیں ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حجت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمہارے انبیاء لے کر آئے تھے، اصول دین میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس میں قرآن کی تعلیم توراۃ کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اس کی پیروی کرنے میں اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بری طرح ناکام ہوئے ہو۔ اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کرسکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جارہی ہے جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اس طرح اتمام حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں، دوسری طرف عامۃ الناس پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا وہ ختم ہوگیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہوگئیں کہ وہ اس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلہ میں کھڑے نہ ہوسکے جس جرأت کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً، پچھلے چار رکوعوں میں نوع انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا اسی کے سلسلہ میں ایک خاص قوم کی متعین مثال لے کر بتایا جارہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوام عالم کے سامنے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایتِ الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رونما ہوسکتے ہیں وہ سب اس (باقی صفحہ ۸۹ پر)

تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں۔ اور وہ میں ہوں جس سے تم ڈرو۔ میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی پھر سب سے پہلے تم ہی اس کا انکار کرنے والے نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو[۵۱] اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۵۲]، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸) کی عبرتناک سرگذشت میں نظر آجاتے ہیں۔

رابعاً، اس سے پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاء کے پیرو گر گئے۔ یہودیوں کی اخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی وعملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کو پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخر کار پچھلی امتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گھسے ہیں تو تم بھی اسی میں گھسو گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ، کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا اور کون! نبی اکرم کا یہ ارشاد محض ایک توبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی امتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے۔

۵۲ نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دینِ اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ تمام انبیاء کی طرح انبیاء بنی اسرائیل نے بھی ان کی تاکید کی ہے، مگر یہودی ان سے غافل ہو چکے تھے۔ نماز میں تساہل کرنے لگے تھے اور زکوٰۃ دینے کے بجائے سود کھانے لگے تھے۔

تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو! کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ صبر اور نماز سے مدد لو[۱]، بے شک نماز گراں ہے مگر ان فرماں بردار بندوں پر گراں نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب کو ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اُس نعمت کو جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی[۲]۔ اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہو گی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی[۳]۔

---

[۱] یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستہ پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس دشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلہ میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستہ پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔

[۲] یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علمِ حق تھا اور جسے اقوامِ عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا تا کہ وہ بندگیِ رب کے راستہ پر سب قوموں کو بلائیں اور چلائیں۔

[۳] بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انھی بزرگوں کے صدقہ میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا پا سکتا ہے! انھی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی اِن غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔

یاد کرو[۵۵] وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں[۵۶] کی غلامی سے نجات بخشی ــــ انھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمھارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس حالت میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش[۵۷] تھی۔

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا، پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گذروادیا، پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو چالیس شبانہ روز کی قرار داد پر بلایا[۵۸] تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے[۵۹]۔ اس وقت تم ظالم تھے، مگر پھر بھی ہم نے تمھیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گذار بنو۔

---

[۵۵] یہاں سے بعد کے کئی رکوعوں تک مسلسل جن واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور ترین واقعات ہیں جنھیں اس قوم کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ اسی لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔

[۵۶] "آل فرعون" کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندان فراعنہ اور مصر کا حکمران طبقہ دونوں شامل ہیں۔

[۵۷] آزمائش اس امر کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ نیز آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقہ پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گذار بندے بنتے ہو یا کافر نعمت ہو جاتے ہو۔

[۵۸] مصر سے نجات پانے کے بعد جب یہ قوم سینا کے جزیرہ نما میں پہنچ گئی تو حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے چالیس شب و روز کے لیے کوہ طور پر طلب فرمایا تاکہ وہاں اس قوم کے لیے جو اب آزاد ہو چکی تھی قوانین شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا ہوں۔

[۵۹] گائے یا بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسف کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے من جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا۔

یاد کرو کہ (ٹھیک اس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے) ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان[۱] عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعہ سے سیدھا راستہ پا سکو۔

یاد کرو جب موسیٰ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا) تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ "اے قوم! تو نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو[۲]، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔" اُس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں[۳]۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقہ نے تم کو آ لیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے، مگر پھر ہم نے تم کو جِلا اُٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گذار بن جاؤ۔

---

[۱] فرقان = وہ چیز جس کے ذریعہ سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اردو میں اس کے مفہوم سے قریب تر لفظ "کسوٹی" ہے۔

[۲] توراۃ کی روایت سے اس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوم کے جن افراد نے گوسالہ پرستی کی تھی اور اس کی ترویج میں حصہ لیا تھا ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآن کے الفاظ اس مفہوم کے محتمل ہیں مگر بعد کی آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سزا کے نفاذ سے پہلے اللہ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔

[۳] یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی جس قرارداد پر حضرت موسیٰ طور کی طرف تشریف لے گئے تھے اس موقع پر آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستّر نمائندے بھی لے کر آؤ۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی تو آپ نے اسے اُن نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس پر ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمہارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ جب تک کہ ہم خود آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ہمیں یقین نہیں آ سکتا۔

پھر (صحرائے سینا میں) ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا[۷۱]، من و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے فراہم کی[۷۲] اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انھوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔

پھر جب ہم نے کہا کہ "یہ بستی[۷۳] جو تمھارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ، ہم تمھاری خطاؤں سے درگذر کریں[۷۴] گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے"، تو جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا،

---

[۷۱] یعنی اس لق و دق بیابان میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمھیں میسر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمھارے بچاؤ کا انتظام کیا۔

[۷۲] مَنّ اور سلویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس بے آب و گیاہ بیابان میں ان لوگوں کو مل رہی تھیں۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ یہ چیزیں اب بھی اس علاقہ میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور اسی نام سے موسوم ہیں (بائیبل کی کتاب خروج۔ باب ۱۶ میں اس کی تفصیل درج ہے)

[۷۳] صحرائے سینا سے گذر کر بنی اسرائیل مواب کے میدانی علاقہ میں پہنچے جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں واقع ہے اور وہاں سے اپنے آبائی ملک کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس موقع پر ان کے سامنے ایک طرف شِطِّیم وغیرہ شرق اردن کی بستیاں تھیں اور دوسری طرف دریائے اردن کے مغرب میں اریحا (یا یریحو) تھا۔ غالباً انہی میں سے کسی کو فتح کرنے کا حکم ہوا ہوگا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

[۷۴] "سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو" یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسو بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہو، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور حِطَّۃٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتل عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگذر اور عام معافی کا اعلان کرتے جاؤ۔ تم دوسروں کو معاف کرو گے تو خدا تمھیں معاف کرے گا۔

ع اور یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کرتے رہے تھے۔

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو،
چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے[۱] اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کونسی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔
اس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔
یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰ، ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، اپنے
رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ ترکاری، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ نکال دے"
تو موسیٰ نے کہا "کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجہ کی چیزیں لینا چاہتے ہو[۲]؟ اچھا، کسی شہری آبادی
میں جا رہو، جو کچھ تم مانگتے ہو وہاں مل جائے گا"۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور
پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے
کفر کرنے لگے[۳] اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے[۴]۔ یہ نتیجہ تھا اُن کی نافرمانیوں کا اور اِس بات کا کہ وہ حدودِ
ع شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔

---

[۱] وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاحوں نے اسے دیکھا ہے اور اس میں شگاف بھی پائے جاتے ہیں۔

[۲] یہ مطلب نہیں ہے کہ من و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مشقت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لئے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرانوردی تم سے کرائی جا رہی ہے اس کے مقابلہ میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی زیادہ مرغوب ہے کہ اُس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے برداشت نہیں کر سکتے؟

[۳] آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے مزعومات یا خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ (باقی صفحہ ۹۵ پر)

یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا اندیشہ نہیں۔[۱۰]

(بقیہ صفحہ ۹۴) ارشاداتِ الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق بدل ڈالا۔

[۹] مثلاً حضرت یسعیاہ، یرمیاہ، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام کو قتل کیا۔ حضرت عیسیٰ کے قتل کا اقدام کیا، بلکہ یہ لوگ اپنی طرف سے تو ان کو سولی پر چڑھا ہی چکے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے انھیں اپنی قدرت سے بچا لیا۔ یہودی علما اور عوام جن قوانین کے خود قائل تھے اُن کی رو سے بھی ان انبیاء نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا جس کی بنا پر وہ قتل کے مستحق ہوتے۔ ان کا قصور اگر تھا تو یہ تھا کہ انھیں گناہوں پر ٹوکتے تھے، ریاکاریوں پر ملامت کرتے تھے، ایمان داری اور راستبازی کی تائید کرتے تھے۔ اس پر یہ لوگ ان کے دشمن بن گئے اور جھوٹے الزام رکھ رکھ کر انھیں قتل کی سزائیں دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو جھوٹا مقدمہ بنایا گیا وہ اس قوم کے دامن پر ایک مستقل داغ ہے اور اس سے زیادہ بدنما داغ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ جیسے ایک مردِ صالح کا سر محض ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کر دیا گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱۰] جس سلسلۂ عبارت میں یہ آیت آئی ہے اس کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے اور اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ اُن کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، بہرحال نجات اس کے لیے مقدر ہے، اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بتایا گیا کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمھاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عملِ صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہو گا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔

عملِ صالح کے متعلق یہ بات اور ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اعمال کی ظاہری صورتوں کا نام (باقی صفحہ ۹۶ پر)

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے طور کو تم پر اُٹھا کر تم سے[۵] پختہ وعدہ لیا تھا اور کہا تھا کہ "جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انھیں یاد رکھنا اسی ذریعہ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چل سکو گے۔" مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمھارا ساتھ نہ چھوڑا ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

پھر تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ معلوم ہے جنھوں نے سبت[۵۲] کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) عمل صالح نہیں ہے، مثلاً نفس یہ فعل کہ تم نے غریب کو کھانا کھلایا، یا کسی بیمار کی مدد کی، نیک عمل نہ کہلائے گا، بلکہ اس لفظ کا اطلاق صرف ان اعمال پر ہوگا جو اللہ کو اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرنے کے بعد، اپنے آپ کو اس کے سامنے ذمہ دار سمجھتے ہوئے، اس کی کتاب اور اس کے نبی کی رہنمائی کے مطابق کیے جائیں۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ خود مختارانہ طریقہ پر آپ جن اعمال کو نیک سمجھتا ہے ان پر عمل کرتا ہے، یا خدا کی رضا کے لیے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے کرتا ہے، یا اعمال کے نیک و بد ہونے کا معیار و ضابطہ خدا کے مقرر کیے ہوئے قانون کے بجائے کہیں اور سے لیتا ہے وہ صالح نہیں، باغی ہے۔ خدا کے اُس بندے کو خدا کی سلطنت میں رہتے ہوئے یہ رویہ اختیار کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی ظاہری نیکی حقیقی نیکی کس طرح ہو سکتی ہے؟ نیکی تو حقیقت میں پابندیٔ قانون کا نام ہے اور خدا کی اس سلطنت میں قانون صرف خدا ہی کا مسلّم ہے، اس قانون کی اطاعت سے منہ موڑ کر جو عمل بھی کوئی کرتا ہے وہ سلطانِ کائنات کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ انسانیت کی عمدہ صفات کا اظہار کرتے ہیں ان میں اور اُن لوگوں میں جو رذیل اور مفسدانہ و شریرانہ صفات کا اظہار کرتے ہیں، خدا کے نزدیک فرق ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] اس واقعہ کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ مشہور و معروف واقعہ تھا۔ لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا۔ ایسا ہی کچھ نقشہ سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں کھینچا گیا ہے۔

[۵۲] سبت = ہفتہ کا دن، شنبہ۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مخصوص رکھیں اور اس میں کوئی دوسرا کام نہ کریں۔

کہہ دیا کہ بندو بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے[۱۱]۔ اس طرح ہم نے ان کے انجام کو اُس زمانہ کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔

پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو؟ موسیٰ نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو، لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے، ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے، اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔ موسیٰ نے جواب دیا، اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پکار اُٹھے کہ ہاں اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے[۱۲]۔ ع ۸

---

[۱۱] اس واقعہ کی تفصیل سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں بیان ہوئی ہے۔ ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی۔ اور بعض اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور انداز بیان سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں جسمانی تھا۔ اور میرے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔

[۱۲] چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض (باقی صفحہ ۹۸ پر)

اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے، اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ، دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔[ف] مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخرکار تمھارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ خیر، تم اس خیال میں نہ رہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل ہے۔

(بقیہ صفحہ ۹۷) کی چھوت لگ گئی تھی اس لیے ان پر فرض کیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے، تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بُت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اُسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پوری طرح ایمان اترا ہوا نہ تھا اس لیے انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرکار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانہ میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ف اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی "لاش کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا ایک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اُس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی، کجا کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہو۔

اب کیا ان لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے[1] ہو کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف[2] کی۔ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملتے تو کہہ دیا کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیہ کی بات چیت ہوئی تو کہا کہ بے وقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلہ میں انھیں حجت میں پیش کریں[3]؟ ——— اور کیا یہ جانتے

---

[1] خطاب اُن نومسلموں سے ہے جو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق روایات یہ کچھ رہی ہیں ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمھاری دعوت حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ بات ارشاد فرمانے کی خاص طور پر ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اُس زمانہ میں یہودیوں نے اپنی ظاہری مذہبیت اور اپنے علم کتاب کا اچھا خاصا سکّہ اہل عرب پر بٹھا رکھا تھا خصوصیت کے ساتھ اہل مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ان یہودیوں سے بہت مرعوب تھے۔ پھر جب مدینہ والوں نے اسلام قبول کیا تو قدرتی طور پر ان کو یہ توقع تھی کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتب الٰہی کے پیرو ہیں وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ اس راہ میں پیش پیش نظر آئیں گے۔ لہٰذا ان کو یہ بتا دینا ضروری تھا کہ یہ لوگ صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں، اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انھی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں، دین حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی یہ ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں گے۔

[2] "ایک گروہ" سے مراد ان کے علماء اور حاملین شریعت ہیں۔ "کلام اللہ" سے مراد توراۃ، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاء کے ذریعہ سے پہنچیں۔ "تحریف" کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اس کے اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشاء کے خلاف ہوں۔

[3] ان کا مطلب یہ تھا کہ توراۃ اور دیگر کتب آسمانی میں جو پیشینگوئیاں اس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ان کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے تمھاری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے، انھیں مسلمانوں کے سامنے

(باقی صفحہ ۱۰۰ پر)

نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے ؟ ـــــ ان میں ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو کچھ علم رکھتے نہیں، بس اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں[۱۰]۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو[۱۱] اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضہ میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں، ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔ وہ کہتے ہیں[۱۲] کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں الّا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو، کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے جس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹) بیان نہ کرو ورنہ یہ تمہارے رب کے سامنے ان کو تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فساد عقیدہ کا حال تھا۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا۔ اسی لیے بعد کے جملۂ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۰] یہ ان کے عوام کا حال تھا کہ علم کتاب سے کورے تھے، کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اصول بتائے ہیں، اخلاق اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں، اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور جھوٹی توقعات پر جی رہے تھے۔

[۱۱] یہ اُن کے علماء کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے صرف یہی نہ کیا کہ کلام الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعۂ کتب مقدسہ میں جگہ پالی، اللہ کا کلام بن کر رہ گیا (باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا ؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمہ ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے ؟ آخر تمھیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوئے گی ؟ جو کبھی بدی کمائے گا اور اپنی خطاکاری کے چکر میں پڑا رہے گا وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور

ع ۹ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یاد کرو ! اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا، بالعموم لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب بھی پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کا لین دین کرتے ہو حالانکہ انھیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل

(حواشی صفحہ ۱۰۰) اس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔

۵۵ یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے کہ وہ سمجھتے ہیں، ہم خواہ کچھ کریں بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۶ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینہ کے اطراف میں جو یہودی قبائل آباد تھے (باقی صفحہ ۱۰۲)

ذخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے، لہٰذا آخرت میں ان کے لیے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ وہاں انھیں کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ع

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے، پھر عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روحِ پاک[۱] سے اس کی مدد کی۔ مگر یہ تمھارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمھاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمھارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی کی، پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا؟ ۔۔۔ وہ کہتے ہیں، ہمارے دل محفوظ ہیں[۲]۔ نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ۔۔۔ اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) انھوں نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے جب ایک عرب قبیلہ کی دوسرے قبیلہ سے جنگ ہوتی تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ یہ فعل صریح طور پر کتاب اللہ کے خلاف تھا اور وہ جانتے بوجھتے کتاب کی یہ خلاف ورزی کر رہے تھے۔ مگر لڑائی کے بعد جب ایک یہودی قبیلہ کے اسیرانِ جنگ دوسرے یہودی قبیلہ کے ہاتھ آتے تھے تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر انھیں چھڑاتا تھا، اور اس فدیہ کے لین دین کو جائز ٹھیرانے کے لیے کتاب اللہ سے استدلال کیا جاتا تھا۔ گویا کتاب اللہ کی اس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیرانِ جنگ کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے مگر اس حکم کو ٹھکرا دیتے تھے کہ آپس میں جنگ ہی نہ کی جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] "روحِ پاک" سے مراد علمِ وحی بھی ہے، اور جبریل بھی جو وحی کا علم لاتے تھے، اور خود حضرت مسیح کی اپنی پاکیزہ روح بھی جس کو اللہ نے قدسی صفات بنایا تھا۔ اور "روشن نشانیوں" سے مراد وہ کھلی کھلی علامات ہیں جنھیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالبِ حق انسان یہ معلوم کر سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

[۲] یعنی ہم اپنے عقیدہ و خیال میں اتنے پختہ ہیں کہ تم خواہ کچھ کہو ہمارے دلوں پر تمھاری بات کا اثر نہ ہوگا۔

کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے[۹۵]، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت اِن نہ ماننے والوں پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں[۹۶] کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا![۹۷] لہٰذا اب یہ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب اُن سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اُسے مانو تو انھوں نے کہا کہ ہم صرف وہ چیز قبول کرتے ہیں جو ہمارے ہاں (یعنی نسل اسرائیل میں) اُتری ہے۔ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اُسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔ اچھا ان سے کہو، اگر تم اُس تعلیم پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمھارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل ہی میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمھارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آئے پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ ان کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا

---

[۹۵] یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے جب یہودی انتہائی پستی و خستہ حالی میں مبتلا تھے اور دنیا میں ہر جگہ مارے کھدیڑے جا رہے تھے، اُس وقت وہ اپنی گھڑیاں اُس نبی کے انتظار میں کاٹا کرتے تھے جس کی بعثت کی پیشینگوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں، اور دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ عرب اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے ہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے۔

[۹۶] اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "کیسی بُری چیز ہے جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا"۔ یعنی اپنی فلاح و سعادت اور اپنی نجات کو قربان کر دیا۔

[۹۷] یہ لوگ چاہتے تھے کہ آنے والا نبی ان کی قوم میں پیدا ہو۔ مگر جب وہ ایک دوسری قوم میں پیدا ہوا جسے وہ اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہو گئے۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ان سے پوچھ کر نبی بھیجتا۔ جب اس نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے فضل سے خود جسے چاہا نواز دیا تو وہ بگڑ بیٹھے۔

بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو طور کو تمھارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمھارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں، اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو، اگر تم مومن ہو تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔

ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے مخصوص ہے تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو[۵۵] اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے اس کا اقتضا یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں)۔ اللہ ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے حتیٰ کہ یہ اس معاملہ میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے۔ حالانکہ لمبی عمر بہرحال انھیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انھیں دیکھ ہی رہا ہے۔ ع ۱۱

ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو[۵۶] اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل ہی نے اللہ کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر اس بنا پر کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہے تو اس سے کہدو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کے دشمن

---

[۵۵] یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے ان کی دنیا پرستی پر۔ جن کو واقعی دار آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔

[۵۶] یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں ہی کو برا نہ کہتے تھے بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریل کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے وہ ہمارا دشمن ہے، وہ رحمت کا نہیں عذاب کا فرشتہ ہے۔

ہیں اللہ اُن کافروں کا دشمن ہے۔ ہم نے تمھاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں، اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کریں گے جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب اُنھوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب اِن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو اِن کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو ان اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اِس طرح پسِ پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں، اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین، سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے[۱۰۵] ۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے ۔ اور پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھ، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کفر میں مبتلا نہ ہو[۱۰۶]"۔ پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں[۱۰۷]۔ ظاہر تھا کہ اذن

---

[۱۰۵] شیاطین سے مراد شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و مادّی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی و اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو جادو ٹونے اور طلسمات و "عملیات" کی طرف ان کی توجہات مبذول ہونے لگیں اور وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے کہ کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں سے سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں اور وہ ہم تمھیں بتاتے ہیں چنانچہ یہ لوگ نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی حق کی آواز انھوں نے سن کر دی۔

[۱۰۶] اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔ مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل کا اخلاقی زوال انتہا کو پہنچا ہوا تھا اس وقت دو فرشتے انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے (باقی صفحہ ۱۰۶ پر)

الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ـــ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انھیں معلوم ہوتا! اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ ان کے لیے

ع ۱۲ زیادہ بہتر تھا، کاش انھیں خبر ہوتی!

(بقیہ حواشی صفحہ ۱۰۵) بھیجے گئے تھے جس طرح قوم لوط کے پاس خوبصورت لڑکوں کی شکل میں فرشتے آئے تھے۔ ان فرشتوں نے ایک ایسی چیز پیش کی جس کے طالب وہی لوگ ہو سکتے تھے جو بداخلاقی کی حد کو پہنچ چکے ہوں۔ پھر اتمام حجت کے لیے وہ ہر ایک کو متنبہ بھی کر دیتے تھے کہ دیکھو ہم تمھارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود وہ لوگ اسی چیز کے طالب ہوئے اور اس طرح ان کا جرم پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔ـــ فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جاکر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

۱۰۵ یہ اس اخلاقی زوال کا انتہائی درجہ تھا جس میں یہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کی آخری حد یہ ہے کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔ اس لیے کہ ازدواجی تعلق انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی، اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ پس بدترین مفسد وہ ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ لگائے جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہو۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ شیطان اعظم ابلیس زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ بھیجتا ہے، پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شر کھڑا کیا، مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں تفرقہ ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے ـــ (باقی صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸)

لے ایمان لانے والو ! سَرَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے بات کو سنو۔ یہ کافر تو عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، خواہ اہل کتاب میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انھیں عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ملے اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں کو اُن شرارتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو یہودیوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں، ان شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ان خاص خاص نکات پر کلام کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی گفتگو میں زیر بحث آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی موشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سے سوال نکالنے کی بیماری ان سیدھے اور سچے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے، اور خود نبی اکرم کی مجلس میں آکر پُر فریب مکارانہ باتیں کرکے اپنی گھٹیا درجہ کی ذہنیت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

ملے یہودی جب آنحضرت کی مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقہ سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذومعنی الفاظ بولتے۔ زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ اور کہہ دیتے، اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے در پردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذومعنی لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں انھیں کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے تو وہ سَرَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ایک ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے، یا ہماری بات سن لیجیے، مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے "سُن، تو بہرا ہو جائے"۔ اور خود عربی میں اس کے ایک معنی صاحبِ رعونت اور جاہل و احمق کے بھی تھے، (باقی صفحہ ۱۰۸ پر)

ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بُھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی[1]۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی فرمانروائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبر گیری کرنے اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے؟ پھر کیا تم اپنے رسول سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۷) اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو تو ہم تمھاری سنیں، اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنی "اے ہمارے چرواہے" کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے انظرنا کہا کرو یعنی ہماری طرف توجہ فرمائیے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ "توجہ سے بات کو سنو"، یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبی کی باتیں سُننی چاہییں تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے احکام اور اس کے احکام میں فرق کیوں ہے؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ تمھارا قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اُس تعلیم کے ایک حصہ کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں سے محو کر دوں، مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں یا کم از کم ویسی ہی۔

کیے جا چکے ہیں؟ حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمھارے لیے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو[2] یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے، جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ سب ان کی اپنی تمنائیں ہیں، ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی، حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔ ۱۳ع

[1] یہودی نُکتہ آفرینیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے ذہن میں پیدا کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کو بار بار متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل و قال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو، جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو، بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رُک جاؤ۔ دوراز کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو۔

[2] یعنی ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہو، اپنا توازن نہ کھو بیٹھو، ان سے بحث و مناظرے کرنے اور جھگڑنے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو، صبر سا تھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے، فضولیات میں اپنی قوتیں صرف کرنے کے بجائے خدا کے ذکر اور بھلائی کے کاموں میں انھیں صرف کرو کہ یہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ہے نہ کہ وہ۔

یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں، عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں ۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں ۔ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے ۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں، ان کا فیصلہ اللہ ہی قیامت کے روز کرے گا ۔ مگر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو ۔ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں[۱] ۔ ان کے لیے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ۔

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، جس طرف بھی تم رُخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رُخ ہے[۲] ۔ اللہ بڑی وسعت والا[۳] اور سب کچھ جاننے والا ہے ۔

۱؎ یعنی بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں ان کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ اُن کے متولی ہوں، ہونا یہ چاہیے کہ خدا پرست اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے متولی رہیں تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی تو انہیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے ۔ یہاں ایک لطیف اشارہ کفار مکہ کے اس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ان برادرانِ قومی کو جو اسلام لاچکے تھے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا ۔

۲؎ یعنی اللہ نہ شرقی ہے نہ غربی، وہ کسی سمت یا کسی مقام میں مقید نہیں ہے، لہذا نہ تو اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا مقام کو مقرر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ وہیں اُسی جانب ہے، اور نہ یہ کوئی جھگڑنے اور بحث کرنے کے قابل بات ہے کہ پہلے تم وہاں یا اس طرف عبادت کرتے تھے، اب تم نے اس جگہ یا سمت کو بدل کیوں دیا ۔ یہ اشارہ اس اعتراض کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں پر سمتِ قبلہ بدلنے کے سلسلہ میں کر رہے تھے ۔ آگے چل کر اس کا مفصل جواب آنے والا ہے ۔

۳؎ "اللہ بڑی وسعت والا ہے" یعنی وہ محدود ہے نہ تنگ نظر ۔

ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے اِن باتوں سے، اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اس کی مِلک ہیں، سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجِد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتا؟ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے بھی لوگ کہتے تھے۔ اِن سب کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں، (اس سے بڑھ کر نشانی کیا ہوگی کہ) ہم نے تم کو علمِ حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں اُن کی طرف سے تم ذمہ دار و جواب دہ نہیں ہو۔

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو[1]۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اُس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں[2]۔ اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ع ۱۴

---

[1] یہ عام اہل کتاب کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ وہ کبھی تم سے خوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی ناراضی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ سچے طالب حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے، بلکہ وہ تو اس لیے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اصول و احکام کو اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جو فروشی کیوں نہ کی جو خود اُن کا شیوہ ہے۔ لہٰذا انھیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کر لو، دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں، اور عقائد و اعمال کی انھی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔

[2] یہ اہل کتاب کے صالح عنصر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ دیانت اور راستی کے ساتھ خدا کی کتاب کو پڑھتے ہیں اس لیے جو کچھ کتاب اللہ کی رُو سے حق ہے اسے حق مان لیتے ہیں۔

مقالات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(۳)

قوم لوط | قوم ابراہیم کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کی اصلاح پر حضرت ابراہیم کے بھتیجے حضرت لوط مامور کیے گئے تھے۔ اس قوم کے متعلق بھی قرآن سے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس بات کی منکر تھی کہ اللہ خالق اور رب بمعنی اول و دوم ہے، البتہ اسے انکار اس سے تھا کہ اللہ ہی کو تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی میں بھی رب مانے اور اس کے معتمد علیہ نمائندے کی حیثیت سے رسول کے اقتدار کو تسلیم کرے۔ وہ مخلوق و مربوب ہونے کے باوجود اپنے لیے یہ آزادی باقی رکھنا چاہتی تھی کہ اپنی خواہش کے مطابق خود جس طرح چاہے کام کرے۔ یہی اس کا اصلی جرم تھا اور اسی بنا پر وہ عذاب میں مبتلا ہوئی۔ قرآن کی حسب ذیل تصریحات اس پر شاہد ہیں:

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۔ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ

(الشعراء۔ ۹)

جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہ کروگے؟ دیکھو میں تمھارے لیے امانت دار رسول ہوں، لہذا اللہ کے غضب سے بچو اور میری اطاعت کرو۔ اس کام پر میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو صرف رب العالمین ہی کے ذمہ ہے۔ کیا دنیا کے لوگوں میں سے تم لڑکوں کی طرف جاتے ہو اور تمھارے رب نے تمھارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہو؟ تم بڑے ہی حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ خطاب ایسے ہی لوگوں سے ہوسکتا تھا جو اللہ کے وجود اور اس کے خالق اور پروردگار ہونے کے منکر نہ ہوں چنانچہ جواب میں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اللہ کیا چیز ہے، یا وہ پیدا کرنے والا کون ہوتا ہے، یا وہ کہاں سے ہمارا رب ہوگیا، بلکہ کہتے یہ ہیں کہ

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (الشعراء - ۹)	اے لوط! اگر تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ملک سے نکال باہر کیے جاؤ گے۔

دوسری جگہ اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (عنکبوت - ۳)	اور ہم نے لوط کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ وہ فعل شنیع کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہ کیا تھا، کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں علانیہ ایک دوسرے کے سامنے بدکاریاں کرتے ہو؟ تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لے آ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔

کیا یہ جواب کسی منکر خدا قوم کا ہوسکتا تھا؟ پس معلوم ہوا کہ اُن کا اصلی جُرم انکارِ اُلوہیت و ربوبیت نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ اگرچہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کو الٰہ اور رب مانتے تھے لیکن اپنے اخلاق، تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کے رسول کی ہدایت پر چلنے کے لیے تیار نہ تھے۔

قومِ شعیب اس کے بعد اہل مدین اور اصحاب الایکہ کو لیجیے جن میں حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تھے۔ اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کے قائل تھے یا نہ تھے۔ ان کی حیثیت دراصل ایک ایسی

قوم کی تھی جس کی ابتدا اسلام سے ہوئی اور بعد میں وہ عقائد و اعمال کی خرابیوں میں مبتلا ہو کر بگڑتی چلی گئی۔ بلکہ قرآن سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مومن ہونے کے بھی مدعی تھے، چنانچہ بار بار حضرت شعیب ان سے فرماتے ہیں کہ "اگر تم مومن ہو" تو تمھیں یہ کرنا چاہیے۔ حضرت شعیب کی ساری تقریروں اور ان کے جوابات کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو اللہ کو مانتی تھی، اُسے معبود اور پروردگار بھی تسلیم کرتی تھی، مگر دو طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئی تھی: ایک یہ کہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کے سوا دوسروں کو بھی الٰہ اور رب سمجھنے لگی تھی اس لیے اس کی عبادت صرف اللہ کے لیے مختص نہ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک اللہ کی ربوبیت کو انسان کے اخلاق، معاشرت، معیشت اور تمدن و سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا، اس بنا پر وہ کہتی تھی کہ اپنی تمدنی زندگی میں ہم مختار ہیں، اپنے معاملات کو جس طرح چاہیں چلائیں۔

قرآن کی حسب ذیل آیات ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں:

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ..... وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ۔

(اعراف - ۱۱)

اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو کہ اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس روشن ہدایت آ چکی ہے۔ پھر تم ناپ تول ٹھیک کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح کی جا چکی تھی، اسی میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم مومن ہو...... اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس ہدایت پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ۔

اور اے برادرانِ قوم! پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے پورے ناپو اور تولو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو۔ اللہ کی عنایت سے کاروبار میں جو بچت ہو وہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تمھارے اوپر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تمھاری نماز تمھیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں؟ تم ہی تو ایک بُردبار اور راستباز رہ گئے ہو!

آخری خط کشیدہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ ربوبیت و الوہیت کے بارے میں ان کی اصل گمراہی کیا تھی۔

فرعون و آلِ فرعون اب ہمیں فرعون اور اس کی قوم کو دیکھنا چاہیے جس کے باب میں نمرود اور اس کی قوم سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ فرعون نہ صرف خدا کی ہستی کا منکر تھا بلکہ خود خدا ہونے کا مدعی تھا، یعنی اس کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ دنیا کے سامنے کھلم کھلا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں خالق ارض و سما ہوں، اور اس کی قوم اتنی پاگل تھی کہ اس کے اس دعوے پر ایمان لاتی تھی۔ حالانکہ قرآن اور تاریخ کی شہادت سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ الوہیت و ربوبیت کے باب میں اس کی گمراہی نمرود کی گمراہی سے اور اس کی قوم کی گمراہی قوم نمرود کی گمراہی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، فرق جو کچھ تھا وہ صرف اس بنا پر تھا کہ یہاں سیاسی اسباب سے بنی اسرائیل کے ساتھ ایک قوم پرستانہ ضد اور متعصبانہ ہٹ دھرمی پیدا ہو گئی تھی اس لیے محض عناد کی بنا پر اللہ کو الٰہ اور رب ماننے سے انکار کیا جاتا تھا اگرچہ دلوں میں اس کا اعتراف

چھپا ہوا تھا جیسا کہ آج کل بھی اکثر دہریوں کا حال ہے۔

اصل واقعات یہ ہیں کہ حضرت یوسف کو جب مصر میں اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے اپنی پوری قوت اسلام کی تعلیم کو پھیلانے میں صرف کردی اور سرزمینِ مصر پر اتنا گہرا نقش مرتسم کیا کہ صدیوں تک کسی کے مٹائے نہ مٹ سکا۔ اس وقت چاہے تمام اہلِ مصر نے دینِ حق قبول نہ کر لیا ہو، مگر یہ ناممکن تھا کہ مصر میں کوئی شخص اللہ سے ناواقف رہ گیا ہو اور یہ نہ جان گیا ہو کہ وہی خالقِ ارض و سما ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کا کم سے کم اتنا اثر ہر مصری پر ضرور ہو گیا تھا کہ وہ فوق الفطری معنوں میں اللہ کو الٰہ الآلہہ اور رب الارباب تسلیم کرتا تھا، یعنی کوئی مصری اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا منکر نہ رہا تھا، البتہ جو ان میں کفر پر قائم رہ گئے تھے وہ الوہیت و ربوبیت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ یہ اثرات حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت تک باقی تھے، چنانچہ اس کا صریح ثبوت وہ تقریر ہے جو فرعونِ موسیٰ کے دربار میں ایک قبطی سردار نے کی تھی۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے دربار کا یہ امیر جو مسلمان ہو چکا تھا مگر اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھا، بے قرار ہو کر بول اٹھا:

أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ ۖ وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۔ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَن يَنصُرُنَا مِن بَأْسِ اللَّهِ إِن جَاءَنَا؟ ..... يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُم مِّثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَ	کیا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے حالانکہ وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے سامنے کھلی کھلی نشانیاں لایا ہے؟ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر ضرور پڑے گا، لیکن اگر وہ سچا ہے تو جس انجام سے وہ تمھیں ڈرا رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر نازل ہو کر رہے گا۔ یقین جانو کہ اللہ کسی حد سے بڑھے ہوئے جھوٹے آدمی کو فلاح کا راستہ نہیں دکھاتا۔ اے برادرانِ قوم! آج تمھارے ہاتھ میں حکومت ہے، زمین میں تم غالب ہو، مگر کل اللہ کا عذاب ہم پر آ جائے

الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِ ھِمْ... وَلَقَدْ جَآءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمْ بِهٖ حَتّٰۤی اِذَا هَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا .... وَیٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ. تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ۔ (المومن ۴-۵)

تو کون ہماری مدد کرے گا؟ .... اے برادران قوم! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر وہ دن نہ آجائے جو بڑی بڑی قوموں پر آچکا ہے، اور وہی انجام تمہارا نہ ہو جو قوم نوح اور عاد اور ثمود اور بعد کی قوموں کا ہوا .... اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تو تم اس چیز کے متعلق شک میں پڑے رہے جسے وہ لائے تھے پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو تم نے کہا کہ اللہ ان کے بعد کوئی رسول نہ بھیجے گا .... اور اے برادران قوم! یہ عجیب معاملہ ہے کہ میں تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو، تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ اُن کو شریک ٹھیراؤں جن کے شریک ہونے پر میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں ہے، اور میں تمھیں اُس کی طرف بلاتا ہوں جو سب سے زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔

یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظیم الشان شخصیت کا اثر کئی صدیاں گذرجانے کے باوجود اس وقت تک باقی تھا اور اس جلیل القدر نبی کی تعلیم سے متاثر ہونے کے باعث یہ قوم جہالت کے اس مرتبے پر نہ تھی کہ اللہ کی ہستی سے بالکل ہی ناواقف ہوتی یا یہ نہ جانتی کہ اللہ رب اور الٰہ ہے اور قوائے فطرت پر اس کا غلبہ و قہر قائم ہے اور اس کا غضب کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ نیز اس کے آخری فقرے سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اللہ کی الوہیت و ربوبیت کی قطعی منکر نہ تھی، بلکہ اس کی گمراہی وہی تھی جو دوسری قوموں کی بیان ہو چکی ہے یعنی ان دونوں حیثیتوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا۔

شبہ جس وجہ سے واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فرعون حضرت موسیٰ کی زبان سے اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (ہم العالمین کے رسول ہیں) سن کر پوچھتا ہے وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (رب العالمین کیا چیز ہے؟)، اپنے

وزیر ہامان سے کہتا ہے کہ میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا کہ میں موسیٰ کے الٰہ کو دیکھوں، حضرت موسیٰ کو دھمکی دیتا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو تم نے الٰہ بنایا تو میں تمھیں قید کر دوں گا، ملک بھر میں اعلان کرتا ہے کہ میں تمھارا رب اعلیٰ ہوں، اپنے درباریوں سے کہتا ہے کہ میں اپنے سوا تمھارے کسی الٰہ کو نہیں جانتا۔ اس قسم کے فقرات دیکھ کر لوگوں کو گمان ہوا ہے کہ شاید وہ اللہ کی ہستی ہی کا منکر تھا، رب العالمین کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھا، اور اپنے آپ ہی کو واحد معبود سمجھتا تھا۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہ تمام باتیں قوم پرستانہ ضد کی وجہ سے تھیں۔ حضرت یوسف کے زمانہ میں صرف یہی نہ ہوا تھا کہ آنجناب کی زبردست شخصیت کے اثر سے اسلام کی تعلیمات مصر میں پھیل گئی تھیں، بلکہ حکومت میں جو اقتدار ان کو حاصل ہوا تھا اس کی بدولت بنی اسرائیل مصر میں بہت با اثر ہو گئے تھے۔ تین چار سو سال تک یہ اسرائیلی اقتدار مصر پر چھایا رہا۔ پھر وہاں اسرائیلیوں کے خلاف قوم پرستانہ جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے یہاں تک کہ ان کے اقتدار کو اُلٹ پھینکا گیا اور مصری قوم پرست خاندان یکے بعد دیگرے فرمانروا ہوتے چلے گئے۔ ان نئے فرماں رواؤں نے محض اسرائیلیوں کو دبانے اور کچلنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ دورِ یوسفی کے ایک ایک اثر کو مٹانے اور اپنے قدیم جاہلی مذہب کی روایات کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس حالت میں جب حضرت موسیٰ تشریف لائے تو ان لوگوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں اقتدار پھر ہمارے ہاتھ سے نکل کر اسرائیلیوں کے ہاتھ میں نہ چلا جائے۔ یہی عناد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ تھا جس کی بنا پر فرعون چندرا کر حضرت موسیٰ سے پوچھتا تھا کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ میرے سوا اور الٰہ کون ہو سکتا ہے؟ ورنہ در اصل وہ رب العالمین سے بے خبر نہ تھا۔ اس کی اور اس کے اہلِ دربار کی جو گفتگوئیں اور حضرت موسیٰ کی جو تقریریں قرآن میں آئی ہیں، اُن سب سے یہ حقیقت بیّن طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک موقع پر فرعون اپنی قوم کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ موسیٰ خدا کے پیغمبر نہیں ہیں کہتا ہے:

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ (الزخرف-۵۰)	تو کیوں نہ اس کے لیے سونے کے کنگن اُتارے گئے یا فرشتے صف بستہ ہو کر اس کے ساتھ کیوں نہ آئے؟

کیا یہ بات ایک ایسا شخص کہہ سکتا تھا جو اللہ اور ملائکہ کے تصور سے خالی الذہن ہوتا؟ ایک اور موقع پر فرعون اور حضرت موسیٰ کے درمیان یہ گفتگو ہوتی ہے:

فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَىٰ مَسْحُورًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا (بنی اسرائیل - ۱۲)

فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو سمجھتا ہوں کہ تیری عقل خبط ہوگئی ہے۔ موسیٰ نے جواب دیا تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں رب زمین و آسمان کے سوا کسی اور کی نازل کی ہوئی نہیں ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ اے فرعون تیری شامت آ ہی گئی ہے

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرعونیوں کی قلبی حالت اس طرح بیان فرماتا ہے:

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (النمل - ۱)

جب ہماری نشانیاں اُن کے سامنے علانیہ نمایاں ہوگئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انھوں نے محض شرارت اور تکبر و سرکشی کی بنا پر ماننے سے انکار کیا۔

ایک اور مجلس کا نقشہ قرآن یوں کھینچتا ہے:

قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ ۝ فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ ۝ قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ يُخْرِجَاكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ - (طٰہٰ - ۳)

موسیٰ نے ان سے کہا تم پر افسوس ہے، اللہ پر جھوٹا افترا نہ باندھو ورنہ وہ سخت عذاب سے تمھیں تباہ کر دے گا اور افترا جس نے بھی باندھا ہے وہ نامراد ہو کر ہی رہا ہے۔ یہ سن کر وہ لوگ آپس میں ردوکد کرنے لگے اور خفیہ مشورہ ہوا جس میں کہنے والوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) تو جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمھارے مثالی (آئیڈیل) طریقِ زندگی کو مٹا دیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور افترا کے انجام سے خبردار کرنے پر ان کے درمیان ردّ وکد اسی لیے شروع ہوگئی تھی کہ ان لوگوں کے دلوں میں کہیں تھوڑا بہت اثر خدا کی عظمت اور اس کے خوف کا موجود تھا، لیکن جب اُن کے قوم پرست حکمراں طبقہ نے سیاسی انقلاب کا خطرہ پیش کیا اور کہا کہ موسیٰ اور ہارون کی بات ماننے کا انجام یہ ہوگا کہ مصر پھر اسرائیلیت سے مغلوب ہو جائے گی تو ان کے دل پھر سخت ہوگئے اور ان سب نے بالاتفاق رسولوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ہم بآسانی یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان اصل جھگڑا کس بات پر تھا، فرعون اور اس کی قوم کی حقیقی گمراہی کس نوعیت کی تھی، اور فرعون کس معنی میں الوہیت و ربوبیت کا مدعی تھا۔ اس غرض کے لیے قرآن کی حسب ذیل آیات کو ترتیب وار ملاحظہ کیجیے:۔

(۱) فرعون کے درباریوں میں سے جو لوگ حضرت موسیٰ کی دعوت کا استیصال کرنے پر زور دیتے تھے وہ ایک موقع پر فرعون کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (اعراف - ۱۵)	کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائے اور آپ کے الٰہوں کو چھوڑ دے؟

دوسری طرف انہی درباریوں میں سے جو شخص حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا تھا وہ ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ (المومن - ۵)	تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان کو شریک کروں جن کے شریک ہونے کے لیے میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں۔

ان دونوں آیتوں کو جب ہم ان معلومات کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں جو تاریخ و آثار قدیمہ کے ذریعہ سے ہمیں اُس زمانہ کے اہل مصر کے متعلق حاصل ہوئی ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فرعون خود بھی اور اس کی

قوم کے لوگ بھی ربوبیت کے پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بعض دیوتاؤں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر فرعون فوق الفطری معنوں میں خدائی کا مدعی ہوتا، یعنی اگر اس کا دعویٰ یہی ہوتا کہ سلسلۂ اسباب پر وہ خود حکمراں ہے اور اس کے سوا کوئی زمین و آسمان کا الٰہ و رب نہیں ہے تو وہ دوسرے الٰہوں کی پرستش نہ کرتا۔[1]

(۲) فرعون کے یہ الفاظ جو قرآن میں نقل کیے گئے ہیں کہ:

یَٰٓأَیُّہَا ٱلۡمَلَأُ مَا عَلِمۡتُ لَکُم مِّنۡ إِلَٰہٍ غَیۡرِی (القصص ۴)	لوگو! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی الٰہ کو جانتا نہیں ہوں۔
لَئِنِ ٱتَّخَذۡتَ إِلَٰہًا غَیۡرِی لَأَجۡعَلَنَّکَ مِنَ ٱلۡمَسۡجُونِینَ (الشعراء - ۲)	اے موسیٰ اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کردوں گا۔

ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرعون اپنے سوا دوسرے تمام الٰہوں کی نفی کرتا تھا، بلکہ اس کی اصل غرض حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنا تھا۔ چونکہ حضرت موسیٰ ایک ایسے الٰہ کی طرف بلا رہے تھے جو صرف فوق الفطری معنی ہی میں معبود نہیں ہے بلکہ سیاسی و تمدنی معنی میں امر و نہی کا مالک اور اقتدار اعلیٰ کا حامل بھی ہے اس لیے اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہارا ایسا الٰہ تو میرے سوا کوئی نہیں ہے، اور حضرت موسیٰ کو دھمکی دی کہ اس معنی میں میرے سوا کسی کو الٰہ بناؤ گے تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

نیز قرآن کی ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے ، اور تاریخ و آثار قدیمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ

---

[1] بعض مفسرین نے محض اس مفروضہ پر کہ فرعون خود اللہ العالمین ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا، سورہ اعراف کی مذکورۂ متن آیت میں اِلٰهَتَكَ کی قرآت اختیار کی ہے اور الٰهَة کو بمعنی عبادت لیا ہے، یعنی ان کی قرأت کے مطابق آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "آپ کو اور آپ کی عبادت کو چھوڑ دے"۔ لیکن اول تو یہ قرأت شاذ ہے اور معروف قرأت کے خلاف ہے، دوسرے وہ مفروضہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے جس پر یہ قرأت اختیار کی گئی ہے، تیسرے الٰهة کے معنی عبادت کے علاوہ معبودہ یا دیوی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ سورج کے لیے عرب جاہلیت میں الٰهة ہی کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور یہ معلوم ہے کہ بالعموم مصریوں کا صنم اکبر سورج ہی تھا۔

فراعنہ مصر محض حاکمیت مطلقہ (Absolute sovereignty) ہی کے مدعی نہ تھے بلکہ دیوتاؤں سے اپنا رشتہ جوڑ کر ایک طرح کی قدوسیت کا بھی دعویٰ رکھتے تھے تاکہ رعایا کے قلب و روح پر ان کی گرفت خوب مضبوط ہو جائے۔ اس معاملہ میں تنہا فراعنہ ہی منفرد نہیں ہیں، دنیا کے اکثر ملکوں میں شاہی خاندانوں نے سیاسی حاکمیت کے علاوہ فوق الفطری الوہیت و ربوبیت میں بھی کم و بیش حصہ بٹانے کی کوشش کی ہے اور رعیت کے لیے لازم کیا ہے کہ وہ ان کے آگے عبودیت کے کچھ نہ کچھ مراسم ادا کرے۔ لیکن دراصل یہ محض ایک ضمنی چیز ہے۔ اصل مقصد سیاسی حاکمیت کا استحکام ہوتا ہے اور اس کے لیے فوق الفطری الوہیت کا دعویٰ محض ایک تدبیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مصر میں اور دوسرے جاہلیت پرست ملکوں میں بھی ہمیشہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی شاہی خاندانوں کی الوہیت بھی ختم ہوتی رہی ہے، اور تخت جس کے پاس گیا ہے الوہیت بھی اسی کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی ہے۔

(۳) فرعون کا اصلی دعویٰ فوق الفطری خدائی کا نہیں بلکہ سیاسی خدائی کا تھا۔ وہ ربوبیت کے تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی کے لحاظ سے کہتا تھا کہ میں سرزمین مصر اور اس کے باشندوں کا رب اعلیٰ (Over-lord) ہوں، اس ملک اور اس کے تمام وسائل و ذرائع کا مالک میں ہوں، یہاں کی حاکمیت مطلقہ کا حق مجھ ہی کو پہنچتا ہے، یہاں کے تمدن و اجتماع کی اساس میری مرکزی شخصیت ہے، اور یہاں قانون میرے سوا کسی اور کا نہ چلے گا۔ قرآن کے الفاظ میں اس کے دعوے کی بنیاد یہ تھی:

وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (الزخرف - ۵)	اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی کہ اے قوم! کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں اور یہ دریا میرے ماتحت نہیں بہتے ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

یہ وہی بنیاد تھی جس پر نمرود کا دعوائے ربوبیت مبنی تھا حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ، اور اسی بنیاد پر حضرت یوسف کا ہمعصر فرعون بھی اپنے اہل ملک کا رب بنا ہوا تھا۔

(۴) حضرت موسیٰ کی دعوت جس پر فرعون و آلِ فرعون سے ان کا جھگڑا تھا، دراصل یہ تھی کہ اللہ رب العالمین کے سوا کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا الٰہ اور رب نہیں ہے، وہی تنہا فوق الفطری معنی میں بھی الٰہ اور رب ہے اور سیاسی و اجتماعی معنی میں بھی۔ پرستش بھی اسی کی ہو، بندگی و اطاعت بھی اسی کی، اور پیروی قانون بھی اسی کی۔ نیز یہ کہ صریح نشانیوں کے ساتھ اس نے مجھے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے، میرے ذریعہ سے وہ اپنے امر و نہی کے احکام دے گا، لہٰذا اس کے بندوں کی عنانِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں نہیں، میرے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اسی بنا پر فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت بار بار کہتے تھے کہ یہ دونوں بھائی ہمیں زمین سے بے دخل کر کے خود قابض ہونا چاہتے ہیں اور ہمارے ملک کے نظام مذہب و تمدن کو مٹا کر اپنا نظام قائم کرنے کے درپے ہیں:-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ۔ (ہود- ۹)

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور صریح نشانِ ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداران قوم کی طرف بھیجا تھا، مگر ان لوگوں نے فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر راستی پر نہ تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (الدخان-۱)

ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ ایک معزز رسول ان کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو، میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، اور اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو، میں تمہارے سامنے صریح نشانِ ماموریت پیش کرتا ہوں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (المزمل-۱)

(اے اہل مکہ) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہی دینے والا ہے، اسی طرح جیسے ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا، پھر فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے سختی کے ساتھ

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ۔ ۳)

فرعون نے کہا اے موسیٰ (اگر تم نہ دیوتاؤں کو رب مانتے ہو نہ شاہی خاندان کو) تو آخر تمھارا رب ہے کون؟ موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص ساخت عطا کی پھر اُسے اس کے کام کرنے کا طریقہ بتایا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ؟ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ؟ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء ۔ ۱)

فرعون نے کہا اور یہ رب العالمین کیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا زمین و آسمان اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ فرعون اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے بولا سنتے ہو؟ موسیٰ نے کہا تمھارا رب بھی اور تمھارے گذشتہ آبا و اجداد کا بھی۔ فرعون بولا تمھارے یہ رسول صاحب جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل ہیں۔ موسیٰ نے کہا مشرق اور مغرب اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے، اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ اس پر فرعون بول اٹھا کہ اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ ۔ ۳)

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن ۔ ۳)

اور فرعون نے کہا چھوڑو مجھے کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں، اور وہ اپنے رب کو مدد کے لیے پکار دیکھے۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمھارے دین کو بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ

انھوں نے کہا کہ یہ دونوں تو جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ اپنے

اَنْ يُّخْرِجَاكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (طٰہٰ - ۳)	جادو کے زور سے تم کو تمھاری زمین سے بے دخل کردیں اور تمھارے مثالی طریق زندگی کو مٹا دیں۔

ان تمام آیات کو ترتیب وار دیکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ربوبیت کے باب میں وہی ایک گمراہی جو ابتدا سے دنیا کی مختلف قوموں میں چلی آرہی تھی، ارض نیل میں بھی ساری ظلمت اسی کی تھی، اور وہی ایک دعوت جو ابتدا سے تمام انبیاء دیتے چلے آرہے تھے، موسیٰ وہارون علیہما السلام بھی اسی کی طرف بلاتے تھے۔ (باقی)

ہمارا کتب خانہ

الجہاد فی الاسلام: قیمت بے جلد چار روپے۔ مجلد پانچ روپے

رسالہ دینیات (اردو) قیمت بے جلد بارہ آنے۔ مجلد ایک روپیہ

سیاسی کشمکش: حصہ اول قیمت بے جلد آٹھ آنے (۸/)

سیاسی کشمکش: حصہ دوم قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

سیاسی کشمکش: حصہ سوم قیمت بے جلد ایک روپیہ (عہ)

مسئلہ قومیت: قیمت بے جلد ایک روپیہ (عہ)

تنقیحات: قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے۔

پردہ: قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے

خطبات: قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مجلد دو روپے

سلامتی کا راستہ: قیمت ایک عدد تین آنے (۳/)

اسلام کا نظریہ سیاسی: قیمت ایک عدد تین آنے (۳/)

اسلامی حکومت کسطرح قائم ہوتی ہے: قیمت ایک عدد تین آنے۔

اسلام اور جاہلیت: قیمت ایک عدد تین آنے (۳/)

نیا نظام تعلیم: قیمت ایک عدد تین آنے (۳/)

تجدید واحیاء دین: قیمت ایک عدد آٹھ آنے (۸/)

ایک اہم استفتاء: قیمت ایک عدد ایک آنہ (۱/)

سیرت سید احمد شہید: طبع جدید قیمت بے جلد دو روپے۔ مجلد (۲؍۸)

الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر: طبع جدید قیمت بے جلد دو روپے (عہ)

ترجمان القرآن حقوق الزوجین نمبر: قیمت دو روپے (عہ/)

ہمارے نبی کے صحابہ: قیمت آٹھ آنے (۸/)

دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور

میلاد النبی

(یہ تقریر ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی۔ اور باجازت آل انڈیا ریڈیو یہاں نقل کی جاتی ہے)

آج اس عظیم الشان انسان کا جنم دن ہے جو زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے رحمت بن کر آیا تھا اور وہ اصول اپنے ساتھ لایا تھا جن کی پیروی میں ہر فرد انسانی، ہر قوم و ملک، اور تمام نوعِ انسان کے لیے یکساں فلاح اور سلامتی ہے۔ یہ دن اگرچہ ہر سال آتا ہے، مگر اب کے سال یہ ایسے نازک موقع پر آیا ہے جب کہ زمین کے باشندے ہمیشہ سے بڑھ کر اُس دانائے کامل کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ معلوم نہیں مسٹر برنارڈ شا نے اچھی طرح جان بوجھ کر کہا تھا یا بے جانے بوجھے، مگر جو کچھ انھوں نے کہا وہ بالکل سچ تھا کہ محمدؐ اگر اس وقت دنیا کے ڈکٹیٹر ہوتے تو دنیا میں امن قائم ہو جاتا۔ میں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود نہ سہی، ان کے پیش کردہ اصول تو بے کم و کاست موجود ہیں، ان کے اصولوں کو بھی اگر ہم راستبازی کے ساتھ ڈکٹیٹر مان لیں تو وہ سارے فتنے ختم ہو سکتے ہیں جن کی آگ سے آج نسلِ آدم کا گھر جہنم بنا ہوا ہے۔

اب سے چودہ سو برس پہلے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قدم رکھا تھا اس وقت خود ان کا اپنا وطن اخلاقی پستی، بدنظمی اور بدامنی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ قرآن میں اس وقت کی حالت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے کہ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے جس سے خدا نے تمھیں بچایا۔ اس سے کچھ بہتر حالت دنیا کے دوسرے ملکوں کی نہ تھی۔ ایران اور مشرقی رومی سلطنت اس وقت انسانی تہذیب کے دو سب سے بڑے گہوارے تھے۔ اور ان دونوں کو ایک طرف آپس کی باہم لڑائی اور دوسری طرف خود اپنے گھر کے معاشرتی امتیازات، معاشی ناہمواری اور مذہبی جھگڑوں نے تباہ کر رکھا تھا۔ ان حالات میں محمد صلی

اللہ علیہ وسلم اٹھے اور تئیس برس کے اندر انھوں نے نہ صرف عرب کو بدل ڈالا بلکہ ان کی رہنمائی میں عرب سے جو تحریک اٹھی تھی اس نے ایک چوتھائی صدی کے اندر ہندوستان کی سرحدوں سے شمالی افریقہ تک دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اخلاق، تمدن، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی میں درست کرکے رکھدیا۔

یہ اصلاح کیوں کر ہوئی، ایک مختصر گفتگو میں اس کی ساری تفصیلات بیان کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کے موٹے موٹے اصول میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جس پر انھوں نے زور دیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان صرف خدائے واحد کو اپنا آقا، مالک، معبود اور حاکم تسلیم کریں، خدا کے سوا کسی کی بندگی قبول نہ کریں، اور صرف مذہب کے محدود دائرے ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے معاملات میں تنہا خدا کے اقتدار اعلیٰ کے آگے جھک جائیں۔

اس کے ساتھ دوسری اہم چیز ان کی تعلیم میں یہ تھی کہ انسان کی مطلق العنانی اور غیر ذمہ داری کو بالکل ختم کردیا جائے، ہر انسان فرداً فرداً اور انسانی جماعتیں، خواہ وہ خاندانوں اور قبیلوں کی شکل میں ہوں یا طبقات کی شکل میں، خواہ قوموں کی شکل میں ہوں یا ریاستوں اور حکومتوں کی شکل میں، بہرحال سب کے سب اپنے آپ کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھیں۔ انھوں نے انسان کا تصور ہی یہ پیش کیا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب ہے۔ اس کو جس قدر اور جس حیثیت میں بھی کچھ اختیارات حاصل ہیں دراصل وہ اس کے ذاتی اختیارات نہیں ہیں بلکہ خدا کے دیے ہوئے ہیں اور ان کے استعمال میں وہ بالآخر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

خدائی اقتدار اعلیٰ اور انسانی خلافت کی بنیاد پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کے درمیان منصفانہ وحدت و اتفاق کا وہ رشتہ فراہم کیا جو کسی دوسرے ذریعہ سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ نسل ونسب، زبان، رنگ، وطن، معاشی مفاد اور دوسری جتنی چیزیں سوسائیٹی کی بنیاد بنتی ہیں وہ لازمی طور پر انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے ایک دوسرے کا مدمقابل بنا دیتی ہیں۔ ان میں اگر موافقت ہوتی بھی ہے تو اغراض کی بنا پر

ایک ناپائیدار عارضی موافقت ہوتی ہے۔ کشمکش اور جنگ اس تقسیم کی عین فطرت میں داخل ہے اور اس کا لازمی نتیجہ بے انصافی ہے۔ اس کو دور کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ تمام انسانوں کو خدا کی بندگی پر متحد کیا جائے اور خدا کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس پیدا کر کے انصاف پر آمادہ کیا جائے۔

قومیت اور طبقات کے بجائے خدا کی بندگی اور خلافت کے تصور پر جس عالمگیر سماجی زندگی کی بنیاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اس کے ہر پہلو کو انھوں نے پائیدار اخلاقی اصولوں پر ڈھال دیا۔ ان کے اخلاقیات تارک الدنیا درویشوں کے لیے نہیں تھے بلکہ دنیا کا کام چلانے والے لوگوں کے لیے تھے۔ کسان، زمیندار، مزدور، کارخانہ دار، تاجر، خریدار، پولیس مین، مجسٹریٹ، کلکٹر، جج، گورنر، سپاہی اور سپہ سالار، وزیر اور سفیر ہر ایک کو اس کے دائرۂ عمل میں انھوں نے اخلاق کے ایسے ضابطوں سے باندھ دیا جس کی بندشوں کو کھولنا اور کسنا، جس کے اصولوں کو بنانا اور بگاڑنا افراد یا رائے عام کی خواہشات پر منحصر نہیں تھا۔ انھوں نے معاشرت اور شخصی تعلقات کو، آرٹ اور ادب کو، کاروبار اور لین دین کو، سیاست اور انتظام ملکی کو، بین الاقوامی تعلقات اور صلح و جنگ کو، غرض انسانی زندگی کے سارے معاملات کو، اخلاق کا پابند بنایا اور جو چیز بھی انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہو اس کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر نشوونما پائے۔

یہ وہ بڑے بڑے اصول تھے جن پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلاحی پروگرام مبنی تھا۔ اس پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ انفرادی اصلاح سے شروع ہوتا تھا۔ ان کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ اجتماعی اصلاح کے ہر نقشہ کا دارومدار بالآخر افراد ہی پر جا کر ٹھیرتا ہے۔ کسی بہتر سے بہتر نظام کو بھی کمزور کیرکٹر اور ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگوں کو لے کر کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ افراد کی سیرت کی خامیوں سے ایک نظام کے عمل درآمد میں جو رخنے اور شگاف پڑتے ہیں، انھیں کاغذ پر نہیں بھرا جا سکتا۔ کاغذ کی دنیا میں آپ مختلف ممکن خرابیوں کے سدباب کا جس قدر چاہیں خیالی انتظام کریں، لیکن عمل کی دنیا میں اس کاغذی نقشہ کو

چلانے کا انحصار جن افراد پر ہے وہ اگر خواہشات، اغراض اور تعصبات سے شکست کھا جانے والے لوگ ہوں، ان میں اگر سچا ایمان اور پختہ کیرکٹر نہ ہو تو آپ کی ساری خیالی احتیاطوں کے باوجود اس نظام میں رخنے پڑیں گے اور ایسی ایسی جگہوں سے پڑیں گے جہاں تک آپ کا تصور بھی نہ جا سکے گا۔ بخلاف اس کے کاغذ پر ایک نظام کو دیکھ کر آپ اس میں بہت سے رخنوں کا امکان ثابت کر سکتے ہیں، لیکن اس کو چلانے کے لیے اگر بھروسے کے قابل افراد موجود ہوں تو ان کا صحیح عمل ان سارے رخنوں کو بھر دے گا جن کے رونما ہونے کا امکان عالم خیال میں آپ کو نظر آتا ہو۔

اسی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی ساری قوت ایسے افراد کو تیار کرنے پر صرف کی جو آپ کے پروگرام کے مطابق بہترین طریقہ پر دنیا کی اصلاح کر سکتے ہوں۔ انھوں نے ایسے لوگ تیار کیے جو ہر حال میں خدا سے ڈر کر بدی سے پرہیز کرنے والے ہوں، جو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو پیش نظر رکھنے والے ہوں، جو ہر اس کام سے رک جانے والے ہوں جس کے متعلق انھیں خدا کی ناراضی کا اندیشہ ہو اور ہر اس کام میں دل و جان سے کوشش کرنے والے ہوں جس کے متعلق انھیں معلوم ہو جائے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔ جنھیں خدا کی خوشنودی پر اپنی کسی چیز کو قربان کرنے میں تامل نہ ہو۔ جن کے دل میں خدا کے سوا کسی کا خوف، کسی کی مہربانی کا لالچ اور کسی کے انعام کی تمنا نہ ہو، جن کے لیے پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کوئی فرق نہ ہو، جو رازِ سر بستہ پردوں میں بھی اتنے ہی نیک، شریف، اور پرہیزگار رہوں جتنے پبلک میں منظر عام پر نظر آئیں۔ جن پر یہ بھروسہ کیا جا سکے کہ بندگانِ خدا کی جان، مال، آبرو اگر ان کے چارج میں دیدی جائے تو خیانت کا ارتکاب نہ ہوں گے، اپنی ذات یا اپنی قوم و حکومت کی طرف سے کوئی عہد کریں تو بے وفا نہ نکلیں گے۔ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں تو ظلم نہ پائے جائیں گے، لین دین کے بازار میں بیٹھیں تو بدمعاملگی نہ کریں گے، حق مانگنے میں خواہ سست ہوں مگر حق ادا کرنے میں سست نہ ہوں گے، اور اپنی ذہانت، ہوشیاری، تدبر اور قوت و قابلیت کو راستی اور انصاف کے لیے اور انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کریں گے نہ کہ شخصی یا قومی اغراض کی خاطر دوسروں کو بے وقوف بنانے

اور دوسروں کے حق تلف کرنے کے لیے۔

کامل پندرہ سال ایسے افراد کی تیاری میں صرف کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حق پرستوں کی ایک مٹھی بھر جماعت تیار کی، جو صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کی اصلاح کے لیے سچا عزم رکھتی تھی اور جس میں عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے بھی افراد شامل تھے۔ اس جماعت کو منظم کرنے کے بعد انھوں نے وسیع پیمانہ پر سماج کی اصلاح کے لیے عملی جدوجہد شروع کی اور صرف آٹھ برس میں پندرہ لاکھ مربع میل پھیلی ہوئی سرزمینِ عرب کے اندر مکمل اخلاقی، معاشی، تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کر کے رکھ دیا۔ پھر وہی جماعت جسے انھوں نے منظم کیا تھا عرب کی اصلاح سے فارغ ہو کر آگے بڑھی اور اس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بیشتر حصے کو اس انقلاب کی برکتوں سے مالا مال کر دیا جو عرب میں رونما ہوا تھا۔

آج ہم نئے نظام (نیو آڈر) کی آوازیں ہر طرف سے سُن رہے ہیں لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جن بنیادی خرابیوں نے پُرانے نظام کو آخر کار فتنہ بنا کر چھوڑا وہی اگر صورت بدل کر کسی نئے نظام میں بھی موجود ہوں تو وہ نیا نظام ہوا کب۔ وہ تو وہی پرانا نظام ہوگا جس کے کاٹنے اور ڈسنے سے جاں بلب ہو جانے کے بعد ہم نئے نظام کا تریاق مانگ رہے ہیں۔ انسانی اقتدارِ اعلیٰ، خدا سے بے نیازی و بے خوفی، قومی و نسلی امتیازات، ملکوں اور قوموں اور طبقوں کی سیاسی و معاشی خود غرضیاں، اور ناخدا ترس افراد کا دنیا میں برسرِ اقتدار ہونا، یہ ہیں وہ اصلی خرابیاں جو اس وقت تک نوعِ انسانی کو تباہ کرتی رہی ہیں اور آئندہ بھی اگر ہماری زندگی کا نظام انہی خرابیوں کا شکار رہا تو یہ ہمیں تباہ کرتی رہیں گی۔ اصلاح اگر ہو سکتی ہے تو انہی اصولوں پر ہو سکتی ہے جن کی طرف انسانیت کے ایک سچے بہی خواہ نے اب سے صدیوں پہلے ہماری محض رہنمائی ہی نہ کی تھی بلکہ عملاً اصلاح کر کے دکھا دی تھی۔

ہیگل مارکس اور اسلامی نظام

(بقیہ باب ششم)

سود کی ممانعت سود کو ممنوع قرار دے کر اسلام نے معاشی زندگی کے ایک بڑے مفسدہ کو جڑ سے مٹا دیا۔ سود کی وجہ سے زرپرست ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور اُن کی گاڑھی کمائی سے اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں۔ سود کا عام رواج دولت کی نامساوی تقسیم کا بھی سبب ہے جس سوسائٹی میں یہ رواج عام ہوگا اُس پر ہمیشہ طبقہ واری کشمکش اور غربت وفلاکت کی لعنت مسلط رہے گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے ہر طرح کے سود کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ وہ تجارتی اور کاروباری سود ہو یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے جیسا کہ آج کل بہت سے تجدد پسند کہا کرتے ہیں کہ تجارتی اور معاشی کاروبار کے سلسلہ میں جو سود دیا جاتا ہے اس کی نوعیت اس سود سے مختلف ہے جس کی ممانعت اسلام نے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی کاروباری سود چیز ہی دوسری ہے وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موجودہ ظالمانہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی سود ہے۔ اگر آج حکومتیں سود کو ممنوع قرار دیدیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ سود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے اُسے کاروبار کے نفع ونقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ سود کی معینہ رقم حاصل کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ کاروبار سے منفعت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ سود کے بغیر سرمایہ کی فراہمی محال ہوگی اور بغیر سرمایہ کے بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو چلانا محال ہوگا حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر سود کو مٹا کر اس کی جگہ منافع (Profits) کی بنیاد پر معاشی تنظیم استوار کی جائے تو اس کی وجہ سے موجودہ زمانہ کی بے شمار معاشی خرابیاں اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔ سود اور منافع میں بڑا فرق یہ ہے کہ سود ایک معینہ رقم ہے لیکن منافع میں رقم کا تعین نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جمع کی ہوئی رقم پر پانچ فی صدی سود حاصل کر سکتا ہے تو اسے بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ سال کے ختم پر اتنی رقم ملے گی۔ لیکن اگر کاروبار اصول منفعت پر چل رہا ہو اور اسے بتا دیا جائے کہ منافع کا اتنا فی صدی حصہ تمھیں ملے گا تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے ختم سال پر کیا ملے گا۔ کیونکہ پہلے تو وہ یہی نہیں جانتا ہے کہ تجارت کو نفع ہوگا یا نقصان۔ اور اگر نفع کا یقین بھی ہے تو بھی وہ اپنے حصہ کا تعین نہیں کر سکتا۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں (Investors) کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے۔ انھیں تو سال کے ختم پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ بند کر کے وہ اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی پر انھیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کی کارروائیوں پر انھیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ اُن کا کوئی نمائندہ بینک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے۔ کم از کم ان لاتعداد روپیہ لگانے والوں کی حد تک یہ بالکل صحیح ہے جن کا تعلق سرمایہ داروں کے گروہ سے نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کا تابع رہتا ہے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے روپیہ لگانے والوں کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ بینک جس طرح چاہتے ہیں ان کا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اس طرح بینکروں کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آجاتی ہے جسے وہ اپنے ہم طبقہ سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر چونکہ بینکنگ کا پورا نظام ایک محدود جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بطور لازمی نتیجہ کے ساری تجارت و صنعت اور سارے مالی ذرائع (Financial resources) پر بھی یہی محدود جماعت قابض ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بینکنگ کا نظام تجارت و صنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی تجارت

اور صنعت بینکوں کے تعاون یا ان کی امداد کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مالی نظام جس طبقہ کے ہاتھ میں ہوگا تجارت و صنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہوگا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ بینک آف انگلینڈ کا صدر زار روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار و اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ یہ استعارہ نہیں ہے حقیقت ہے۔

اگر سود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط اور دیکھ بھال سے کام لے گا کیونکہ اس صورت میں وہ صرف نفع کا شریک نہ ہوگا بلکہ نقصان میں بھی اُسے شرکت کرنا پڑے گی۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بینک کے انتظام میں موثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بینک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر ہر وقت نظر رکھیں گے۔ ساہوکاروں کی طاقت اس طرح بہت کم ہو جائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روپیہ لگانے والے صرف ایسے ہی کاروبار اور صنعتوں میں اپنا روپیہ لگائیں گے جن کی ملک کو واقعی ضرورت ہو اور جن کی پیداوار کے لیے پہلے ہی سے بازار میں مانگ موجود ہو۔ ایسا نہ کرنے سے انھیں نقصان کا اندیشہ ہوگا۔ یہ نہ ہوگا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ سرمایہ ایسی پیداوار پر صرف کیا جائے جس کی مانگ بازار میں نہیں، پھر اس پیداوار کی نکاسی کے لیے مصنوعی طلب پیدا کی جائے (To create demand)۔ اب ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنے فاضل سرمایہ سے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے نئی نئی اشیا بنانے میں صرف کرتا ہے جن کی مانگ نہیں ہوتی ہے۔ پھر اس خوف سے کہ مبادا اس پیداوار کی کھپت نہ ہو اشتہار بازی اور دیگر جائز و ناجائز طریقوں سے لوگوں میں نئی نئی خواہشات پیدا کی جاتی ہیں اور مصنوعی طور سے اُن کی ضروریات کو بڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ ان اشیا کی خریداری پر مائل ہوں حالانکہ در اصل انھیں ان اشیا کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اسی وجہ سے ان چیزوں کی مانگ بھی پہلے سے نہیں ہوتی۔ یہ چیز بھی براہ راست موجودہ بینک کاری (Banking) کے نظام کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اہل صنعت (Industrialists) کو بینکوں کی وجہ سے باآسانی سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بینکوں پر بھی سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور صنعت پر بھی۔ اس لیے معاشی زندگی کے ان دونوں ستونوں کی

ہلی بھگت رہتی ہے۔

لیکن اگر سود کے بجائے منافع پر صنعتی اور مالی نظام چلایا جائے تو یہ صورت حال باقی نہیں رہے گی۔ منافع پر کاروبار کی صورت میں روپیہ لگانے والے مجبور ہوں گے کہ وہ یا تو خود کسی طریقہ سے بینکوں کے حساب وکتاب پر نگرانی رکھیں یا حکومت سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ وہ بینکوں کے حسابات کی جانچ پڑتال اور تنقیح کے لیے عمال مقرر کرے۔ دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ بینک کاری افراد کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آجائے گی یا کم از کم بینکوں پر اس کی موثر نگرانی قائم ہو جائے گی۔ اس طرح بے قید سرمایہ داری کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اگر بینک کاری کا نظام اس طرح سے بالکلیہ حکومت کے ہاتھ میں آجائے تو حکومت پوری صنعتی اور معاشی زندگی کو اپنی موثر نگرانی میں لے سکے گی۔ کیونکہ بینک کاری معاشی نظام کی شہ رگ ہے۔ لیکن یہ اُسی صورت میں مفید ہوگا جب خود حکومت پر عوام الناس کے حقیقی نمائندوں کا قبضہ ہو یعنی ان لوگوں کا جو دل وجان سے عوام کی فلاح وبہبود کے خواہاں ہوں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بینک کاری نظام تو حکومت کے ہاتھ میں ہو لیکن روپیہ لگانے والے بھی نگرانی اور مشاورت کی غرض سے مجالس انتظامی میں اپنے منتخب نمائندے بھیجیں تاکہ یہ نظام، حکومت اور افراد کے باہمی تعاون پر مبنی ہو۔

اکتناز مال کی ممانعت غیر متوازن اور بے قید سرمایہ داری کو مٹانے کی غرض سے اسلام نے اکتناز مال Accumulation of wealth کو قطعاً ممنوع قرار دیا چنانچہ کلام مجید نے صریح الفاظ میں اعلان کیا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ	ان لوگوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنادو جو
وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ	سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس میں کا کوئی حصہ خدا
اَلِیْمٍ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی	کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا جب ان کے
بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ	چہرے اور پیشانیاں اسی سونے چاندی سے داغی

ھذا ما کنزتم لانفسکم جائیں گی کہ یہ ہے وہ سونا چاندی جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔

قتلِ عمد کے بعد شاید ہی کسی عمل کے لیے قرآن نے اس قدر سخت وعید سنائی ہو جتنی کہ اس آیت میں ان لوگوں کو سنائی گئی ہے جو خدا کی راہ میں صرف کیے بغیر مال و دولت جمع کرتے ہیں۔ پھر جس طرح قتلِ عمد کے مجرم کو اسلامی مملکت کے تحت قصاص کی سزا دی جاتی ہے اسی طرح اس آیت کی بنا پر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے شخص کو مناسب سزا دے جس کے متعلق اس امر کی کافی اور لائق اطمینان شہادت فراہم ہو جائے کہ وہ راہ خدا میں صرف کیے بغیر مال و دولت جمع کر رہا ہے۔ اگر قتلِ عمد کی آیت ایک نص صریح ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس آیت کو بھی ہم نص قطعی نہ قرار دیں۔ جب کہ دونوں میں یکساں طور سے ایک ہی لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے تحت یا اس کے بعد دوسری اسلامی حکومتوں کے تحت اس طرح مال و دولت جمع کرنے کو قانوناً ممنوع کیوں نہیں قرار دیا گیا اور کیوں نہ اس کی سزا معین کی گئی؟ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ موجودہ بینک کاری نظام کے وجود میں آنے سے قبل حکومت کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے وہ یہ معلوم کر سکتی کہ کون شخص کتنی دولت رکھتا ہے اور اگر رکھتا ہے تو اس میں سے کتنا حصہ راہِ خدا میں صرف کرتا ہے۔ اس لیے اگر اس زمانہ میں اکتنازِ مال کو قانوناً ممنوع قرار بھی دے دیا جاتا تو بھی عملاً اس قانون کا نفاذ غیر ممکن تھا۔ موجودہ زمانہ میں متمول افراد اپنی دولت کا زیادہ حصہ بینکوں میں رکھتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لیے آج کل حکومت اس بات کی نگرانی کر سکتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ میں صرف کیے بغیر روپیہ پیسہ جمع نہ کرنے پائیں۔ لیکن یہ جبھی ممکن ہوگا کہ بینک کاری کا نظام افراد کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آجائے یا کم از کم حکومت کی موثر نگرانی میں کام کرے۔ مثلاً حکومت ایک ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ جن لوگوں کی اتنی اتنی رقم بینک میں جمع ہو انھیں اس میں سے کم از کم اتنا روپیہ خدا

کی راہ میں صرف کرنا ہوگا، اور وہ بھی انفرادی طور سے نہیں بلکہ حکومت کے واسطے سے تاکہ اسے اس امر کا اطمینان حاصل رہے کہ معینہ رقم کسی اور مصرف میں نہیں لائی گئی۔ جو لوگ قرضدار ہوں یا کسی اور ذمہ داری (Liability) کے حامل ہوں انھیں لائق اطمینان ثبوت ملنے پر مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ قرض اور دیگر ذمہ داریوں کو منہا کرنے کے بعد ان کی جمع کردہ رقمیں معینہ اقل ترین نصاب (Fixed minimum) سے کم ہوں۔

سود کے سلسلہ میں موجودہ نظام بینک کاری کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے نیز اکتناز مال کی ممانعت کا لحاظ کر کے یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ آئندہ اسلام کے سیاسی غلبہ کے ساتھ جب اسلامی حکومتیں قائم ہوں گی تو وہ موجودہ انفرادی بینک کاری (Private banking) کو بالکل مسدود کر دینگی اور اس کی جگہ ایسا نظام قائم ہوگا جو یا تو بالکل حکومت کے ہاتھ میں ہوگا یا حکومت اور عوام کے نمائندوں کے باہمی تعاون سے کام کرے گا۔

قانون وراثت اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو بدرجۂ اتم ملحوظ رکھا ہے کہ اجتماعی دولت زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہوتی رہے۔ اسلامی قوانین کی رو سے متوفی کا ترکہ جس میں جائداد منقولہ اور غیر منقولہ دونوں شامل ہیں، صرف بڑے بیٹے کو نہیں ملتا ہے بلکہ سب چھوٹے بڑے بیٹوں کو، اور ان کے علاوہ بیوی بیٹیوں، باپ، ماں سب کو ملتا ہے۔ اور اصول و فروع کی غیر موجودگی میں بھائیوں اور بہنوں تک کو حصہ پہنچتا ہے۔ اس طرح دولت اور جائداد جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہوتی ہے۔ اگر اس کا مقابلہ یورپ کے قوانین سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں اکثر ممالک میں متوفی کی جائداد و اموال کا حق دار صرف بڑا بیٹا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مال و دولت اور جائداد چند افراد کے ہاتھوں میں جمع رہتی ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اصلاح لیکن اسلام نے معاشی زندگی کی اصلاح میں محض بیرونی ضابطہ بندی کی قوت ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اخلاقی تربیت سے بھی اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہی

چیز اشتراکی نظام اور اسلام کے مابین وجہ امتیاز ہے۔

اشتراکیت نے معاشی زندگی کو سُدھارنے کے لیے صرف خارج میں ضابطہ بندیاں کرنے پر انحصار کر لیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ضابطہ محض جبر اور مادّی طاقت کے بل پر قائم ہوتا ہے اور جو نظام محض زور و طاقت اور جبر پر قائم ہو اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ تمدن کے کسی ضابطہ کو بقا و دوام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ جمہور کے اپنے دلوں میں بھی اُس مقصد کے حصول کی لگن نہ ہو جسے قانون و ضابطہ بزور و جبر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اشتراکی نظام انسان کی پوری معاشی زندگی کو ضابطہ و قانون کی بندش میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس زندگی کے کسی گوشے میں بھی انسان کے ارادے اور مرضی کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطل میں رہیں گے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطل اس کی موت ہے۔ جس دنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقربا کی امداد، غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں، جہاں کسی شخص کو انفرادی طور سے اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے، کسی کے کام آنے، کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقعہ نہ ہو جس جماعت کے افراد باہمی معاملت اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی روح سے خالی ہوں، اس میں اخلاقی احساسات کا نشو و نما غیر ممکن ہے۔ چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہوگا اور نہ کوئی شخص دوسرے کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے گا اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غربا کی اعانت، حاجتمندوں کی حاجت روائی، اور بیماروں کی عیادت و خبر گیری، اور اسی نوع کے دیگر انسانی خصائل یکسر ناپید ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں اجتماعی ادارے ان فرائض کو سرانجام دیں گے۔ لیکن اول تو اجتماعی امداد شخصی اعانت کا بدل نہیں ہو سکتی، دوسرے جب افراد میں انفرادی طور پر اس صنفِ اخلاق کا نشو و نما بند ہو جائے گا تو اجتماعی اداروں کو وہ آدمی مل کہاں سکیں گے جن کے دل دوسروں

کے لیے رحم و شفقت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے لبریز ہوں ۔ شخصی اعانت اخلاقی احساس کی بیداری اور حرکت کا پیمانہ ہے ۔ اجتماعی امداد اور اخلاقی احساس کے مابین کوئی لازمی تعلق نہیں ہے ۔ کیونکہ قائم شدہ روایات، عام رائے کا دباؤ یا محض جذبۂ تقلید اس نوع کی امداد کا محرک ہو سکتا ہے ۔ بخلاف اس کے شخصی عانت کا جذبہ صرف اخلاقی احساس سے تحریک پاتا ہے ۔

اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالے کرکے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے ، اور اس کے تصورات کی اصلاح ، اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل ، اور ایک مناسب اجتماعی ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت میں نہ جائے ۔ اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور با اختیار ارادہ کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے ۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دیدیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا کوئی موقع باقی نہ رہتا ۔ جو شخص قانون کی رو سے اس بات پر مجبور ہو کہ اپنی کمائی ایک لاشخصی (Impersonal) ادارہ کے حوالہ کردے اور پھر اس میں سے صرف اتنا ہی حصہ واپس لے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو اُس پر اخلاقی اچھائی یا بُرائی کا حکم کس طرح لگایا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس عمل میں اس کا آزاد ارادہ نہیں بلکہ قانون کا خوف کام کر رہا ہے ۔ البتہ اگر حکومت اور قانون کے خوف سے بے پروا ہو کر اُس سے یہ عمل سرزد ہوتا تب اس کے اخلاقی نشو و نما کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ۔

اسی لیے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی پُرزور تلقین کی اور بتایا کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت انسان میں راسخ نہ ہو جائے ۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ۔

گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر اسلام انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت و دستگیری کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔ مسلمانوں کی شناخت بتلاتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں سے راہ خدا میں صرف کرتے ہیں) وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (وہ لوگ جو اپنے مال کو ظاہر اور پوشیدہ طور سے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں)۔ پورا قرآن دیکھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ اور نماز کے بعد کسی عمل کی بہ تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے جس جماعت میں انفاق کی روح کام کر رہی ہوگی اس میں غربت و افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سنی جا سکیں گی جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری، محتاجوں کی اعانت یتیموں کی خبرگیری اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسرکار ہوگا وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت پیدا نہیں ہوگی۔ جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں گی وہاں گردش زر Circulation of money میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند رہے گا۔ کیونکہ دنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جتنی مکمل ہوگی معاشی زندگی اتنی ہی پُرسکون ہوگی۔

اس طرح معاشی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو اس کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں اور اس میدان میں وہ اشتراکیت سے اس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام معاشی مساوات (Economic equality) سے زیادہ معاشرتی مساوات (Social equality) کا حامی اور موید ہے۔ معاشی مساوات اسے صرف اس حد تک مطلوب ہے کہ اجتماعی دولت کسی خاص طبقہ میں محدود نہ ہونے پائے۔ بلکہ جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہو اور ہر شخص کو اتنی روزی ضرور میسر آجائے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ابتدائی ضروریات پوری کر سکے۔ اشتراکیت

کی طرح اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ جملہ افراد معاشی حیثیت سے یکساں حالت میں ہوں یا معاشی زندگی کی اونچ نیچ بالکل ہموار اور ہم سطح ہو جائے۔ وہ ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور معاشی نامساوات کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا ہے بشرطیکہ یہ نامساوات ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ البتہ جس چیز کو وہ یکسر مٹا دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت یا تمول کی بنا پر افراد کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق و امتیاز پیدا ہو یا دولت ہی عزت کا واحد معیار ہو جائے۔ اس معاملہ میں اس کی راہ بالکل الگ ہے۔ چنانچہ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جس کے دل میں سب سے زیادہ اس کا خوف ہو۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنے آیا ہے جس میں دولت، علم، ہنر، عہدہ، نسل یا خاندان کوئی بھی عزت کا معیار نہ ہو اور جہاں فرق و امتیاز کی صرف ایک وجہ تسلیم کی جائے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا ترسی اور خدا پرستی میں کیا درجہ حاصل ہے۔

معاشرتی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے نماز باجماعت کو ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے۔ یہ ایک بڑا نفسیاتی حربہ ہے جس سے وہ اپنے پیرووں میں معاشرتی مساوات اور اخوت کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز باجماعت کے التزام سے معاشرتی امتیازات پر ایک کاری ضرب پڑتی ہے۔ مندروں میں یکے بعد دیگرے پوجا پاٹ کرنے یا کلیساؤں میں ہفتہ میں ایک روز کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے سے اخوت و مساوات کا وہ احساس پیدا نہیں ہوتا جو مسجد میں روزانہ پانچ وقت ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ کسی مقام کے تمام مسلمان بلا فرق و امتیاز روزانہ پانچوں وقت مسجد میں اس طرح جمع ہوں اور پھر بھی ان میں باہم وہ بُعد و فصل باقی رہے جو معاشی درجہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اہل ثروت اور اونچے طبقے کے لوگ اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو مساجد میں جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اپنے مکان کے کسی گوشہ میں۔ عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو وہ البتہ مسجد میں نظر آتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ان کی صورت مسجد میں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ

یہی ہے کہ اگر وہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا شروع کریں تو پھر وہ اپنے امتیازات اور معاشرتی مرتبہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرتی مساوات کا قیام معاشی مساوات کے حصول سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ کیونکہ معاشی مساوات کے حصول کے بعد بھی طبقہ واریت Class-stratification پیدا ہو سکتی ہے۔ اشتراکیت نے انسانی زندگی کے اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ طبقاتی امتیازات مختلف شکلوں میں ظہور کر سکتے ہیں۔ طبقہ واریت تنہا دولت اور معاش کی راہوں سے نہیں آتی ہے۔ دوسری راہوں سے بھی اس مہلک مرض کا پھیلنا ممکن ہے۔ اس کا قوی احتمال ہے کہ انسان معاشی حیثیت سے تو ایک دوسرے کے ہم پلّہ ہوں لیکن نسل، خاندان، عہدے یا اور کسی اعزاز کی بنا پر اُن میں امتیازات پیدا ہو جائیں۔ اس صورتِ حال کی مثالیں ہمیں ہندوؤں کی معاشرت میں بکثرت ملتی ہیں جہاں برہمنیت کسی معاشی مفاد پر نہیں بلکہ مذہبی اقتدار پر مبنی ہے۔ اسی طرح چھتریوں نے اپنی ایک علیحدہ معاشرت بنالی ہے۔ ساہوکار اور تجار مالدار ہونے کے باوجود برہمنوں اور چھتریوں سے کمتر درجہ رکھتے ہیں۔ اشتراکیت کے قیام کے بعد بھی ممکن ہے کہ طبقہ واریت کسی اور شکل میں نمودار ہو جائے۔ کسان اور مزدور، عالم اور عامی، پرولتاریہ اور اشتراکی حکمرانوں کے مابین طبقاتی امتیازات اور معاشرتی درجہ بندیوں کے حدود و فاصل قائم ہو جائیں۔ اور معاشی حیثیت سے یکساں ہونے کے باوجود ان کے آدابِ معاشرت میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ اسی صورتِ حال کو دفع کرنے کی غرض سے اسلام نے اجتماعی عبادات کا نظام تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا فرق و امتیاز نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشترک نصب العین کے مطابق زندگی نہ بسر کر سکیں یا ان کے معاشرتی اختلافات سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

مطبوعات

سیرت سید احمد شہید | مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی. ضخامت تقریباً ۵۰۴ صفحات. قیمت ۵ روپے۔ پتہ:۔ محمد معین الدہر صاحب، نمبر ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ۔

اس کے پہلے ایڈیشن پر ان صفحات میں اس سے قبل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ نہایت مسرت کی بات ہے کہ طبع دوم کی نوبت جلد ہی آگئی، اور اس سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ فاضل مولف نے اس دوسری اشاعت کو پہلے سے زیادہ مفصل، پُر از معلومات اور مفید مباحث پر مشتمل بنا دیا ہے۔ اب سے سوا سو برس پہلے اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے جو عظیم الشان تحریک حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ کی سرکردگی میں اٹھی تھی اور جس نے تمام ہندوستان، بلکہ آس پاس کے ممالک تک میں روح اسلامی کی ایک زبردست لہر پھیلا دی تھی، اس کے متعلق پہلی مرتبہ اتنی تفصیلی معلومات اس قدر مستند ذرائع سے اردو زبان میں فراہم ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ اس کا مطالعہ متعدد حیثیات سے مفید ثابت ہوگا، اور خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ اس سے بہت فائدہ اٹھائیں گے جو اسی مقصد عزیز کے لیے پھر ایک مرتبہ سعی کرنا چاہتے ہیں۔

مگر مولف کے کام کی پوری پوری قدر کرنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی اس تحریک کے ساتھ اور اس کے نظام اور طریق عمل، اور اس کی کامیابیوں اور ناکامی کے اسباب، اور اس کے قوی اور کمزور پہلوؤں کے متعلق بہت کچھ مزید معلومات کی تلاش و جستجو ضروری ہے۔ نیز اس ذخیرۂ معلومات کو پوری طرح مفید بنانے کے لیے اس امر کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مرتب کیا جائے اور تاریخ کے ایک محقق طالب علم کی طرح واقعات پر بے لاگ تنقید کی جائے۔ اگر ہمیں اپنے اسلاف کے کاموں اور ان کے تجربات سے اپنے حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کے لیے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے تو سوانح نگاری کے

قدیم طرز میں کافی ترمیم کر کے عقیدتمندی کے عنصر کو کم اور تنقید و تحقیق کے عنصر کو بڑھانا پڑے گا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک | مولانا عبید اللہ سندھی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت ؏ قسم اول ۶؏۔ کتاب خانہ پنجاب، لاہور۔

اس کتاب میں مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اتباع کی مساعیٔ انقلاب و اصلاح کا ایک مجمل تاریخی نقشہ پیش کیا ہے جس میں شاہ صاحب کے ظہور سے لے کر جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے قیام تک کی تاریخ بالکل ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مولانا کا اصل بیان مجمل ہے جس سے ان کا مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوتا، مگر حاشیہ پر ان کے تلمیذ رشید مولانا نور الحق صاحب علوی کی تشریحات مفصل ہیں جن سے مولانا کے بیان کو سمجھنے میں کافی مدد مل جاتی ہے۔ جہاں تک مولانا سندھی کی ذات کا تعلق ہے، کوئی شخص خواہ ان سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو، بہرحال ان کے علم و فضل اور ان کی وسعتِ نظر اور ذکاوت و جودت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے اور جو کچھ ان سے استفادہ کر کے مولانا نور الحق صاحب نے لکھا ہے وہ بہت سے لطیف علمی نکات اور بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے جن کی قدر نہ کرنا ظلم ہوگا۔ لیکن بحیثیت مجموعی جب ہم اس کتاب کو دیکھتے ہیں تو اس میں تاریخ کم اور تاریخ سازی زیادہ نظر آتی ہے۔ اگر عالم برزخ میں شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبد العزیز صاحب اور اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں کو جمع کر کے یہ کتاب ان کے سامنے پیش کی جائے تو بعید نہیں کہ اپنے کارناموں کے اس مرقع کو دیکھ کر وہ حضرات خود بھی دنگ رہ جائیں۔ "حزب ولی اللٰہی" کا جو نظام اور پروگرام بیان کیا گیا ہے، اور معاصر تاریخ کے واقعات سے اس "حزب" کا تعلق جس طرح دکھایا گیا ہے اس کی بیشتر تفصیلات کے لیے غالباً قیاس کے سوا کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔ رہے اس "حزب" کے سیاسی نظریات، تو ان کی جو تعبیر مولانا نے اور ان کے فاضل شارح نے پیش کی ہے اس کے بعض اجزاء کو معنیً صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر بیشتر اجزاء تعبیر و تفسیر کی حد سے متجاوز ہیں۔ ماضی کے واقعات کو جدید طرز پر مرتب کرنا، یا بزرگانِ سلف کے کام کو جدید اصطلاحات

میں بیان کرنا بجائے خود کوئی گناہ نہیں، لیکن اس ترتیب بیان میں ایسے تصورات و نظریات کو داخل کر دینا جو اصلاً وہاں نہ تھے، ہمارے نزدیک کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ آخر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ اپنے تصورات کو ہم خود اپنے ہی تصورات کی حیثیت سے پیش کریں؟ اگلوں کے کام میں ان کا سُراغ لگانے کی کیا ضرورت؟

"حزب ولی اللّٰہی" کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا نے حضرت سید احمد بریلوی اور ان کے متبعین کی صادق پوری جماعت کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ اُس رنگ سے بہت مختلف ہے جس میں حضرت سید احمد کے معتقدین پیش کرتے ہیں۔ ان دو مختلف بیانات میں ایک ایک عنصر صداقت کا بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن دونوں طرف مبالغہ کی رنگ آمیزی بھی اچھی خاصی نظر آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ تاریخ کا ایک بے لاگ طالب علم اصل ماٰخذ کی چھان بین کر کے حقیقت کو جیسی کہ وہ فی الواقع تھی، جوں کا توں بیان کرے۔

اس "حزب" کی پوری تاریخ میں مولانا نے اگر کسی کوتاہی کی نشان دہی کی ہے تو وہ صرف حضرت سید احمد اور ان کے پوربی متبعین کے طرز عمل سے متعلق ہے۔ اس حصہ کو مستثنیٰ کر کے وہ اس حزب کو بے عیب معیار حق کی حیثیت سے پیش فرماتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسی حزب کے اتباع میں حق اور راستی دائر و منحصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تحزُّب کا اقتضا یہی ہے کہ آدمی اپنی پارٹی کو اسی طرح پیش کرے۔ لیکن ہم اس حزب کے ایک ایک بزرگ کی خاکِ پا کو سُرمۂ چشم بنانے کے باوجود نہ تو یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی غلطی و خامی سے پاک تھا، نہ یہ مان سکتے ہیں کہ جس قدر روشنی ہم کو ان کے علوم میں ملتی ہے بس وہی ہمارے لیے کافی ہے، اور نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ ہدایت و رہنمائی کے لیے صرف اسی حزب کو واحد سرچشمہ تسلیم کر لیں۔ ہمیں اگر فی الواقع دینِ اسلام کو از سرِ نو ایک عالمگیر طاقت بنانا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ۱۳ سو برس کی طویل تاریخ میں دنیائے اسلام نے علم و عمل کے جس قدر بہترین نمونے پیش کیے ہیں ان سب کے فوائد اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کریں اور قرآن و سنت کی روشنی میں ماضی و حال دونوں کو خوب دیکھ کر اور سمجھ کر خود اپنی ایک مستقل فکر پیدا کریں۔

فہرست مضامین

ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ (جون ۱۹۴۲ء) جلد ۲۰ عدد ۴

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک

پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر

"ترجمان القرآن"، مبارک پارک لاہور

سے شائع ہُوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اپنے نئے مرکز میں آئے ہوئے ہمیں ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ اس دوران میں یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد کام کا جو نقشہ بنایا گیا ہے اس کو ہم چار عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں: تعلیم و تربیت، علمی تحقیق، دعوتِ عام اور معاشی تدابیر۔ یہاں ہم ان عنوانات کے تحت اس نقشہ کی تفصیلات بترتیب بیان کریں گے تاکہ پیش نظر کام کی نوعیت اور اس کی عملی صورت اچھی طرح واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس کام کو چلانے اور فروغ دینے کے لیے کس قسم کے آدمیوں اور کن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے۔ "جماعت اسلامی" کے تحت جو جماعتیں ہندوستان کے مختلف مقامات پر قائم ہیں ان کے امراء کو چاہیے کہ اپنی اپنی جماعتوں کو مجتمع کر کے یہ نقشہ ان کے سامنے پیش کریں اور اپنے ارکان کی صلاحیتوں اور اپنے جماعتی وسائل کا پوری طرح جائزہ لے کر مرکز کو مطلع کریں کہ کس کس شعبہ میں کام کرنے کے لیے ان کے پاس کس کس قابلیت کے آدمی موجود ہیں اور ہر جماعت ان کاموں کو چلانے کے لیے کیا وسائل بہم پہنچا سکتی ہے۔ جہاں جماعتیں موجود نہیں ہیں اور صرف ارکان انفرادی حیثیت میں موجود ہیں وہاں ہر فردِ جماعت بطورِ خود اس نقشہ کو پیشِ نظر رکھ کر اپنا اور اپنے ذرائع کا جائزہ لے اور ہمیں بتائے کہ وہ اس سلسلہ میں کیا کام کر سکتا ہے یا کیا ذرائع بہم پہنچا سکتا ہے۔ نیز جو لوگ جماعت میں شریک نہیں ہیں مگر اس کام سے دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں وہ بھی اگر کسی حیثیت سے اس میں حصہ لینا چاہیں تو ہمیں مطلع فرمادیں کہ وہ کس نوعیت کا اور کتنا حصہ لینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ اطلاعات ہمیں وسطِ اگست تک مل جانی چاہییں۔ پھر ان سب پر غور کرنے کے بعد جن کو یہاں کام کرنے کے لیے منتخب کیا جائے گا انھیں یہاں بلا لیا جائے گا اور جنھیں باہر کوئی کام تفویض کرنا ہو گا انھیں بھی اطلاع دیدی جائے گی۔

سب سے پہلا کام جو ہم یہاں کرنا چاہتے ہیں ایک درسگاہ و تربیت گاہ کا قیام ہے۔ میں نے اپنے مضمون "نیا نظامِ تعلیم" اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ کوئی تحریک جو

انسانی زندگی میں ایک مکمل اور حقیقی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہو کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اپنے مزاج اور اپنے مقتضیات کے مطابق انسانوں کو ڈھالنے اور بنانے کے لیے تعلیم و تربیت کا ایک نظام قائم نہ کرے۔ پھر میں پہلے مضمون میں تفصیل کے ساتھ اور دوسرے میں مجملاً یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ہمیں اپنی تحریک کے لیے کس طرح کا نظام تعلیم و تربیت درکار ہے۔ اب ان کہی ہوئی باتوں کے اعادہ کی حاجت نہیں، صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ جو کچھ اس وقت کہا گیا تھا اب اسے کرنے کا ارادہ ہے۔ چند رفقا کے مشورہ سے، جو فن تعلیم کو علمی حیثیت سے بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں، میں نے اس درسگاہ کا ایک خاکہ مرتب کرلیا ہے اور خود اپنے دو بچوں سے عملاً اس کی بنا بھی رکھ دی ہے۔ بنیادی اصول وہی ہیں جو ان دونوں مضامین میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ عملی تفصیلات ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں بتمام و کمال اسی مرحلہ میں شائع کر دیا جائے۔ تجربہ سے ابھی ان میں بہت کچھ ردوبدل ہونا ہے۔ جب ہمارا تجربہ کامیاب ہو جائے گا اور ہم خود اس پر مطمئن ہو جائیں گے تو انشاء اللہ اپنا تعلیمی دستور اور نصاب دونوں شائع کر دیں گے۔ تاہم اس کے سرسری خط و خال یہاں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

زمانۂ تعلیم کو ہم نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اساسی، متوسط اور عالی۔

اساسی تعلیم میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہر انسان کو مسلم انسان ہونے کی حیثیت سے دنیا کا کام چلانے کے لیے لازماً جن معلومات، جن اخلاقی اوصاف، اور جن ذہنی اور عملی استعدادوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے بچہ کی شخصیت میں جمع کر دی جائیں۔ ہم اس کو صرف کتاب ہی نہیں پڑھائیں گے بلکہ ہمارا استاد عملاً اس کو اپنی معلومات اور اپنی قابلیتوں سے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام لینا سکھائے گا اور اس کو اس قابل بنائے گا کہ اساسی تعلیم کے مرحلہ سے فارغ ہو کر جب وہ نکلے تو ہر شعبۂ حیات میں وہ ایک عمدہ ابتدائی کارکن بن سکے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہ ہو جس کا استعمال اسے نہ آتا ہو، اور زندگی کی مختلف راہوں میں سے کوئی راہ ایسی نہ ہو جس پر چلنے کے لیے کم از کم ناگزیر معلومات اس کے پاس نہ ہوں۔ علاوہ بریں ہم اسے اتنی عربی بھی سکھائیں گے کہ وہ قرآن کا سیدھا سادہ مفہوم خود سمجھ لے، نیز تعلیم اور تربیت دونوں کے ذریعہ سے

ہم اس کو اسلامی طرزِ زندگی کے ضروری آداب واطوار اور قواعد و قوانین سے بھی نہ صرف آگاہ کر دیں گے بلکہ عملاً ان کا خوگر بنا دیں گے۔ یہ تعلیم تمام بچوں کے لیے یکساں ہوگی کیونکہ ہمارے پیشِ نظر یہ ہے کہ اس مرتبہ کی تعلیم و تربیت ہر بچے کو حاصل ہونی چاہیے قطع نظر اس سے کہ آگے چل کر اسے دنیا میں مزدور یا کسان کی حیثیت سے کام کرنا ہے یا وزیر کی حیثیت سے یا پروفیسر کی حیثیت سے۔

متوسط تعلیم میں بچہ کے داخل ہونے کا انحصار اساسی تعلیم کے نتائج پر ہوگا۔ اساسی تعلیم کی انتہا کو پہنچتے پہنچتے ہر بچہ کے متعلق اندازہ کر لیا جائے گا کہ آیا وہ دنیا کی زندگی میں ابتدائی کارکن کے مرتبہ سے بلند تر خدمات انجام دینے کی قوت رکھتا ہے یا نہیں۔ جن بچوں کے متعلق استادوں کا تخمینہ اور آزمائشی امتحانات کا فیصلہ یہ ہوگا کہ وہ ایسی قوت رکھتے ہیں صرف انہی کو دوسرے مرحلۂ تعلیمی میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی، اور اس مرحلہ میں ہمارے پیشِ نظر یہ ہوگا کہ بچوں کو اُن کاموں کے لیے تیار کیا جائے جن میں جسمانی قوتوں کی بہ نسبت ذہنی قوتوں سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ یہاں ہر بچہ کے لیے ان مضامین کا مجموعہ تجویز کیا جائے گا جن کے ساتھ اس کے ذہن کو مناسبت ہوگی جس شعبۂ زندگی کے لیے اسے تیار کرنا ہوگا اسی سے تعلق رکھنے والے علوم عالیہ کے مبادی اُسے پڑھائے جائیں گے، مگر اس طرح کہ ہر دنیوی علم کے اندر دینی نقطۂ نظر روح کی طرح جاری و ساری ہوگا اور ہر دینی علم کا انطباق دنیوی حالات پر کر کے بتایا جائے گا۔ پھر طالب علم کو اپنے علم سے عملاً کام لینے کی پوری مشق بھی کرائی جائے گی اور تربیت کے ذریعہ سے اس میں ایک سچے مسلمان کی سیرت بھی پیدا کی جائے گی۔

درجۂ عالی کی تعلیم بالکل اختصاصی تعلیم ہوگی اور اس میں ہمارے پیشِ نظر ایسے علما اور ماہرین پیدا کرنا ہوگا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں قیادت و رہنمائی کے اہل ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ اسلام کے اصولوں پر ایک پورے نظامِ تمدن کی تعمیر کر سکیں اور ایک جدید ترین اسٹیٹ کی تنظیم کا بار اٹھا سکیں۔ اس کے لیے جس علم، جس قوتِ اجتہاد، اور جس متقیانہ سیرت کی ضرورت ہے وہ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے پیدا کی جائے گی۔

اور اس درجہ میں صرف وہی طلبہ لیے جائیں گے جن کے متعلق متوسط تعلیم کے نتائج سے یہ اطمینان ہو جائیگا کہ وہ اپنی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں۔

علمی تحقیق کا شعبہ دراصل ہماری تحریک کا دل اور دماغ ہوگا۔ اب تک اس تحریک کا علمی کام تنہا میں ہی کرتا رہا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک اکیلا آدمی ایسی ایک ہمہ گیر و عالمگیر تحریک کے لیے علمی و فکری بنیاد فراہم کرنے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اگر ہمیں واقعی نظام تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ صرف اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ متعدد دوسری زبانوں اور خصوصاً دو تین بین الاقوامی زبانوں میں بھی ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کر دے، اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظام اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کر دے۔ نیز ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوین جدید کرنی ہوگی، اور اسی طرح علوم جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے از سر نو مدون کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ مجرد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظام تمدن و اخلاق میں رونما ہو جائے گا۔

اس غرض کے لیے ہم کو ایک طرف ایسے صاحب فکر و نظر آدمیوں کی ضرورت ہے جو اس تحقیقی کام کے اہل ہوں اور ہمارے جماعتی نظم و ضبط کے اندر رہ کر یہ خدمت انجام دے سکیں۔ دوسری طرف ایک عمدہ کتب خانہ درکار ہے، اور اس کے ساتھ ایسے ذرائع درکار ہیں جن سے ہم ان خدام دین کو سامان زیست بہم پہنچا سکیں۔

سر دست ہم صرف اساسی تعلیم کی درسگاہ قائم کر رہے ہیں۔ اونچے درجوں کے کچھ طلبہ اگر اس مرحلہ پر

آجائیں تو ہم کوشش کریں گے کہ ان کے لیے بھی ایک عارضی نصاب بنا کر تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کر دیں، لیکن ہمارے نظامِ تعلیم کا حقیقی نشوونما اساسی تعلیم ہی سے ہوگا۔ اس درسگاہ کی تعمیر کے لیے ابتدائی مصارف تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوں گے۔ ماہانہ مصارف کا تخمینہ ۸۰۰ روپیہ ہے۔ کم از کم ۶۰ طلبہ سے ہم اس کا افتتاح کر سکتے ہیں۔ ذی استطاعت اصحاب سے فی بچہ ۲۰ روپے ماہوار لیے جائیں گے اور کم استطاعت لوگوں سے دس روپے ماہوار، لیکن کم اور زیادہ فیس دینے والے طلبہ کے درمیان قیام و طعام وغیرہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہ رکھا جائے گا۔ استاد صرف وہی لیے جائیں گے جو جماعتِ اسلامی کے نظام میں شامل ہیں، ہماری تحریک کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور نہ صرف اصول و مقصد میں ہم سے متفق ہیں بلکہ ہمارے ڈسپلن کو بھی قبول کرتے ہیں۔ کچھ استادوں کا انتخاب کیا جا چکا ہے، مگر ہم پوری جماعت کا جائزہ لے کر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے رفقاء میں کون کون لوگ ایسے ہیں جو ابتدائی تعلیم سے فنی واقفیت، حقیقی دلچسپی اور عملی تجربہ رکھتے ہیں۔

ان دونوں تعمیری کاموں کے ساتھ ہم دعوتِ عام کا کام بھی پوری قوت کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہو جائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ جس طرح مذکورۂ بالا تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عامۃ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہو سکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانی ہوگی کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہو سکتا جب تک کہ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عام اس کی تائید میں تیار نہ کر لی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ وہ اُس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں

کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ اس قسم کی دعوتِ عام شروع کرنے کے لیے ابتداءً ضروری ہے کہ چھوٹے پیمانہ پر ایک محدود حلقہ میں کچھ نمونہ کا کام کیا جائے اور داعیوں کی اخلاقی و عملی تربیت کرکے اس حلقہ میں اُن سے کام لیا جائے تاکہ آئندہ وسیع پیمانہ پر دعوت پھیلانے کی راہ کھل جائے۔ اگرچہ اس ضرورت کا احساس ہمیں پہلے بھی تھا لیکن گذشتہ ایک سال کے جماعتی کام سے جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس کی بنا پر ہم کسی تاخیر کے بغیر اس شعبہ کی بنا رکھ دینا چاہتے ہیں

دعوتِ عام کے شعبہ میں کام کرنے کے لیے تمام بیرونی جماعتوں کو اپنے اپنے ارکان کا جائزہ لے کر سرِ دست ایسے ایک ایک دو دو آدمیوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کام کے لیے موزوں تر ہوں اور ان کی صفات و خصوصیات سے مرکز کو مطلع کرنا چاہیے۔ نیز یہ بھی بتانا چاہیے کہ وہ کتنی مدت کے لیے یہاں آکر رہ سکتے ہیں، ان کی ضروریات کیا ہیں، ان کی ذات پر کس قسم کی ذمہ داریوں کا بار ہے، اور یہ کہ وہ خود یا مقامی جماعت کے ارکان کس حد تک ان کی ضروریات کے کفیل ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمیں یہاں کم از کم ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر اور ایک یونانی طبیب کی ضرورت ہے جو محض خدا کے بھروسہ پر اپنے شہری مطب کو ختم کرکے اس جنگل میں آبیں، جیسا بُرا یا بھلا مطب یہاں چل سکتا ہو اُس پر بخوشی قناعت کریں، پوری خدا ترسی اور خالص انسانی ہمدردی کے ساتھ گردوپیش کی آبادی کو طبی امداد بہم پہنچائیں اور اپنے اخلاقِ حسنہ سے دلوں میں گھر پیدا کریں۔ جماعت میں جو حکیم اور ڈاکٹر ایسے موجود ہوں جو اس ایثار کے لیے اپنے نفس کو آمادہ پاتے ہوں وہ ہمیں اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں۔

ظاہر ہے کہ اوپر جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے ان سب کے لیے مالی ذرائع درکار ہیں اور یہاں ان کا

فقدان ہے۔ اتنے بڑے کاموں کے لیے جس اجتماعی اعانت کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہ ہمیں اب تک بہم پہنچی ہے، نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔ نہ ہم وہ تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں جن سے وہ بہم پہنچا کرتی ہے، اور نہ ہمیں اُن لوگوں سے کسی مدد کی امید رکھنے کا کوئی حق ہے جن کا مقصدِ زندگی وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے۔ چند اہلِ خیر ایسے ضرور ہیں جو ہماری درخواست کے بغیر محض حسبۃً للہ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہیں، مگر یہ اعانت اب تک کے جماعتی کاموں کے لیے بھی ناکافی تھی کجا کہ آئندہ جو کام پیشِ نظر ہیں ان کے لیے یہ کچھ بھی کفایت کر سکے۔ اس وقت تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر جماعت کے بُک ڈپو کی آمدنی سے ہوا ہے اور وہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے کہ اس کے بل پر کام میں اتنی توسیع ہو سکے۔ اب اس کارِ عظیم کے لیے جو ذرائع مطلوب ہیں ان کی بہم رسانی دو ہی صورتوں سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ جو لوگ جماعتِ اسلامی میں شریک ہوئے ہیں اور جو لوگ اس کے نصب العین سے ہمدردی رکھتے ہیں، وہ اس راہ میں مالی قربانیاں کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور اُن باطل پرستوں سے سبق لیں جو آج اپنے باطل نظریات کا اقتدار قائم کرنے یا قائم رکھنے کے لیے کروروں پونڈ روزانہ آگ میں پھونک رہے ہیں ۔۔۔ ظاہر ہے کہ پرستارانِ باطل کی ان قربانیوں کے مقابلہ میں اگر پرستارانِ حق کچھ بھی قربانی نہ کریں اور اپنے ذاتی مفاد ہی کی پرستش کرتے رہیں تو قانونِ فطرت کے تحت یہ قطعی ناممکن ہے کہ ہمیں باطل کے مقابلہ میں اُس حق کو فروغ دینے میں کامیابی حاصل ہو جائے جس پر ہم ایمان لائے ہیں ۔۔۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہماری جماعت میں جو لوگ کسی قسم کے صنعتی یا تجارتی کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ یہاں آئیں اور اپنی قابلیتوں سے کام لے کر دولت پیدا کریں اور اس کا ایک حصہ اپنی ذات پر اور دوسرا حصہ اپنے مقصدِ زندگی کی خدمت پر صرف کریں۔

اسی غرض کیلئے ہم نے اپنے پروگرام میں ایک مد معاشی تدبیر کی بھی رکھی ہے۔ یہاں زمین بافراط موجود ہے اور نہایت شاداب و زرخیز ہے، بجلی موجود ہے، بڑی بڑی منڈیاں قریب ہیں، ذرائع حمل و نقل جنگی مشکلات کے باوجود اس وقت تک یہاں دستیاب ہو رہے ہیں۔ متعدد زراعتی، صنعتی اور تجارتی کام قلیل یا کثیر سرمایہ سے یہاں شروع کیے جا سکتے ہیں۔ مقامی جماعتوں کے امرا اپنی اپنی جماعتوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ان کے رفقاء میں سے کون لوگ کیا کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور کس قدر وسائل ان کی دسترس میں ہیں۔ اس باب میں ان کی رپورٹیں وصول ہونے کے بعد ہم ہر ایک کو اسکے حالات کے مطابق مشورہ دینگے اور جس قدر سہولتیں مرکزی ادارہ کی طرف سے بہم پہنچائی جا سکتی ہیں وہ پہنچائی جائیں گی۔

تفہیم القرآن

(۴)

البقرہ

(از رکوع ۲۴ تا رکوع ۳۲)

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہو یہ انسان کے لیے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں[1]۔ نیز اُن سے کہو، یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو، نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو شاید کہ

[1] چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانہ میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام، تخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا، اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع و غروب اور اس کی کمی و بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلہ میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ انہی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے آدمیوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدنی اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے کئی مہینے حج ہی سے وابستہ تھے اور ان مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔[1]

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں[2]، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[3] اُن سے لڑو جہاں بھی تمہارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور اُنھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف اُنھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز

۱؎ منجملہ اُن توہم پرستانہ رسموں کے جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ پیچھے سے دیوار کود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آکر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے بلکہ تمام اوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنی رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت و شقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲؎ یعنی جو لوگ خدا کے کام میں تمہارا راستہ روکتے ہیں اور اس دین کی اشاعت اور اس کے قیام میں مزاحمت کر رہے ہیں اُن سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے تک مسلمانوں کو صرف دعوت و تبلیغ کرنے کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم و ستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب ان کو پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ تمہارے اس دین کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہیں اُن کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے بعد ہی جنگِ بدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

۳؎ یعنی تمہاری جنگ نہ تو اپنی مادی اغراض کے لیے ہو، نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھایا جائے جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کیے جائیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں اور زخمیوں کو قتل کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا، اور دوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال حد سے گذرنے کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں اِن سب کی ممانعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اسی حد تک کیا جائے جتنی اس کی ضرورت ہو۔

آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے[۱]۔

تم اُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے[۲]، پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں[۳]۔ ماہِ حرام کا بدلہ

[۱] یعنی تم جس خدا پر ایمان لائے ہو اس کی صفت یہ ہے کہ بدتر سے بدتر مجرم اور گنہگار کو بھی معاف کر دیتا ہے جبکہ وہ اپنی باغیانہ روش سے باز آجائے۔ یہی صفت تم اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ تمھاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کے دین کا راستہ صاف کرنے کے لیے ہو جب تک کوئی گروہ راہِ خدا میں مزاحم رہے بس اسی وقت تک اس سے تمھاری لڑائی بھی رہے۔ اور جب وہ اپنا رویہ چھوڑ دے تو تمھارا ہاتھ بھی پھر اُس پر نہ اُٹھے۔

[۲] فتنہ کے اصل معنی آزمانے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ سُنار جب سونے کو کُٹھالی میں ڈال کر تپاتا ہے تو اسے فتنہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اُسے آگ کی آزمائش میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ اس میں کھوٹ ہے یا نہیں۔ اسی معنی کی مناسبت سے اُس حالت کو یہاں فتنہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جب کہ کفار برسرِ اقتدار ہوں، کفر کے احکام جاری ہو رہے ہوں، اور خدا پر ایمان رکھنے والے اُن کے قہر و غلبہ کی وجہ سے احکامِ الٰہی پر کلاً یا جزءً عمل نہ کر سکتے ہوں، کیونکہ اس حالت میں مومن کا ایمان بھی سخت آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔

دین کے اصل معنی اطاعت کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد انسان کا یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ کسی بالاتر اقتدار اور کسی بالاتر قانون کو تسلیم کرکے باضابطگی کے ساتھ اس کی اطاعت میں زندگی بسر کرے۔ ایسے ہر نظامِ اطاعت و بندگی کو دین کہا جائے گا قطعِ نظر اس سے کہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل۔

لہٰذا اس آیت کی رُو سے اسلامی جنگ کی غایت یہ قرار پائی کہ فتنہ کی حالت (یعنی غلبۂ کفر و کفار کی حالت) ختم ہو جائے اور اطاعت و بندگی کا پورا نظام اللہ کے لیے خالص ہو کر رہے۔

[۳] باز آجانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آجانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آجانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے، اور جس کی چاہے عبادت کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اُسے فہمائش اور نصیحت کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا

(باقی صفحہ ۲۲۰ پر)

ماہِ حرام ہی ہے[۵۱] اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہی ہوگا، لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو، البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ اُنھی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی حدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔[۵۲] احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔[۵۳]

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عمرے[۵۴] کی نیت کرو تو اُسے پورا کرو۔ اور اگر کہیں گھر جاؤ[۵۵]

(بقیہ صفحہ سابق) کسی کا بندہ بنائے۔ یہ فتنہ بزورِ شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اُس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی اس روش سے باز نہ آجائیں۔

حواشی صفحہ ہذا [۵۱] عرب میں حضرت ابراہیم کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لیے خاص کیا گیا تھا اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارتگری ممنوع تھی تاکہ زائرین کعبہ امن وامان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہوسکیں۔ اس بنا پر ان مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی حُرمت کا لحاظ کفار کریں تو مسلمان بھی کریں، اور اگر وہ اس حرمت کو نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کریں تو مسلمان بھی پھر ماہِ حرام ہی میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

[۵۲] اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی و جہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ اہلِ ایمان اگر اس کام میں اپنا مال صرف کرنے سے جی چرائیں اور اپنے مفاد کو عزیز تر رکھیں تو یہ اُن کے لیے دنیا میں بھی موجبِ ہلاکت ہے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں وہ کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہیں گے اور آخرت میں اُن سے سخت بازپُرس ہوگی۔

[۵۳] احسان کا لفظ حُسن سے نکلا ہے جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو اُسے بس کر دے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

[۵۴] کعبہ کی زیارتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو ذی الحجہ کے چند مقرر دنوں میں کی جاتی ہے (باقی صفحہ ۲۲۱ پر)

توجو قربانی میسر آئے[51] اللہ کی جناب میں پیش کرو اور اپنا سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے[52]۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بنا پر اپنا سر منڈوالے تو اُسے چاہیے کہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے[53]۔ پھر اگر تمہیں امن نصیب ہو جائے[54] (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اُٹھائے وہ حسب مقدور قربانی دے، اور جو قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانہ میں اور سات گھر پہنچ کر اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے گھربار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں[55]۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب

(بقیہ صفحہ ۲۲۰) اس کا نام حج ہے۔ اور دوسری وہ جو ان مقرر ایام کے ماسوا دوسرے دنوں میں کی جاتی ہے۔ یہ عمرہ ہے۔

[50] یعنی اگر راستہ میں کوئی سبب ایسا پیش آجائے جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رُک جانا پڑے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [51] یعنی اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر آئے۔

[52] اس امر میں اختلاف ہے کہ جگہ سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے یعنی اگر آدمی راستہ میں رُک جانے پر مجبور ہو تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیجدے تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گھر گیا ہو وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

[53] حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

[54] یعنی وہ سبب دور ہو جائے جس کی وجہ سے مجبوراً تمہیں راستہ میں رُک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اُس زمانہ میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رُک جانے کا سبب زیادہ تر دشمن اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں "گھر جانے" اور اس کے بالمقابل یہاں "امن نصیب ہو جانے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح "گھر جانے" کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دوسرے تمام موانع شامل ہیں اسی طرح "امن نصیب ہو جانے" کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دور ہو جانے پر حاوی ہے۔ (باقی حواشی صفحہ ۲۲۲ پر)

ع ۲۵ جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کا فیصلہ کرے اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل^{لہ}، کوئی بدکاری^{۲لہ}، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات^{۳لہ} سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفر حج کے لیے زاد راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے^{۴لہ}۔ پس اے ہوشمندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔ اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں^{۵لہ}۔

(بقیہ صفحہ ۲۲۱) ۵ہ عرب جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرنا گناہ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عمرہ کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج دونوں کرلیں۔ البتہ جو لوگ مکہ کے آس پاس میقاتوں کی حدود کے اندر رہتے ہوں انھیں اس رعایت سے مستثنیٰ کر دیا کیونکہ اُن کے لیے عمرہ کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اُٹھانے سے مراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کرکے احرام کھول لے اور اُن پابندیوں سے آزاد ہو جائے جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں، پھر جب حج کے دن آئیں تو از سر نو احرام باندھ لے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱لہ احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلق زن و شو ممنوع ہے بلکہ اُن کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے جو رغبت شہوانی پر مبنی ہو۔

۲لہ تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے۔

۳لہ حتیٰ کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

۴لہ جاہلیت کے زمانہ میں حج کے لیے زاد راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں اُن کے اِس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زاد راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنے اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے وہ اگر زاد راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں (باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

پھر جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اُس نے تمہیں کی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ [۱] پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو، [۲] یقیناً وہ معاف کرنے والا اور

(بقیہ صفحہ سابق) فقیری کی نمائش کرے تو خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اُس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق درست ہوں تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی۔

شہ یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ معاش ایک دنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی جاہلیت کے زمانہ میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمہیں بخشی ہے اس کے مطابق خالصۃً اللہ کی عبادت کرو۔

[۲] حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا طریقہ یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کے ساتھ عرفات جاتے تھے اور ۱۰ کی صبح کو وہاں سے مزدلفہ کی طرف پلٹتے تھے۔ بعد کی صدیوں میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برہمنیت قائم ہوگئی تو انھوں نے کہا ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خزاعہ اور بنی کنانہ اور اُن دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے ان کی شان بھی عام عربوں سے اونچی ہوگئی اور انھوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غرور کا بت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب خاص قریش اور ان کے رشتہ دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطاب عام اُن سب کی طرف ہے جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں انہی کے ساتھ جاؤ، (باقی صفحہ آئندہ پر)

رحم کرنے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباواجداد کا ذکر کرتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔[1] مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے، ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں، پھر جو کوئی دو دن پہلے واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کسی نے دو دن زیادہ صرف کر دیئے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں[2]، بشرطیکہ یہ دن اس نے تقوی کے ساتھ بسر کیے ہوں ۔۔۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے۔

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے[3]، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے[4]۔ جب اُسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) انہی کے ساتھ ٹھیرو، انہی کے ساتھ اٹھو، اور اب تک جاہلیت کے فخر و غرور کی بنا پر سنت ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اہل عرب حج سے فارغ ہو کر جلسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صرف کرتے تھے اب اسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صرف کرو۔

[2] یعنی ایام تشریق میں منیٰ سے مکہ کی طرف واپسی خواہ دو دن پہلے ہو خواہ دو دن بعد، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیت اس کی نہیں کہ تم ٹھیرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے ان میں خدا کے ساتھ تمہارے تعلق کا کیا حال رہا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

اقتدار حاصل ہو جاتا ہے^{۵۵} تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اس کو پکڑ کر گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہو سکتی ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ^{۵۶} اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں اگر اُن کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور بڑا حکیم و دانا ہے۔ (اگر ان ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آموجود ہو

(بقیہ حواشی صفحہ ۲۲۴) ۵۳ یعنی کہتا ہے خدا شاہد ہے کہ میں محض طالب خیر ہوں، اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ صرف حق اور صداقت اور انسانوں کی فلاح کے لیے کام کر رہا ہوں۔

۵۴ اصل لفظ "اَلَدُّ الْخِصَامِ" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا"۔ یعنی جو دشمنی میں ایسا اندھا ہو جائے کہ کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی، غرض کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال سے بھی کام لینے میں تامل نہ کرے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۵۵ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ مزے مزے کی دل لبھانے والی باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو عملاً یہ کرتوت دکھاتا ہے۔

۵۶ یعنی کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے ماتحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے علوم، تمہارے طور طریقے، تمہارے معاملات، اور تمہارے سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو۔

اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟[1] — آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں۔ ع ۵

بنی اسرائیل سے پوچھو، کیسی کھلی کھلی نشانیاں ہم نے اُنھیں دکھائی ہیں، اور پھر یہ بھی اُنھی سے پوچھ لو کہ اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اُسے اللہ کیسی سخت سزا دیتا ہے۔[2]

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اُن کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت

---

[1] یہ الفاظ قابلِ غور ہیں کہ ان سے ایک اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دنیا میں انسان کی ساری آزمائش ہی اس امر کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں، حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اُس وقت کا انتظار نہ کرو جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمھارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا، اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آجائے اور تم بچشمِ سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکن ہے اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے، اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ تمھاری ہستی اُس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے، اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے تو اس ایمان اور اطاعت کی قیمت ہی کیا ہے؟ اس وقت تو کوئی کٹے سے کٹا کافر اور بدتر سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بس اُسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کشائی کی وہ ساعت نہیں آتی اور جب (باقی صفحہ ۲۲۷ پر)

کے روز پرہیزگار مومن ہی اُن کے مقابلہ میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا کا رزق تو اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے بے حساب دے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے اُن کا فیصلہ کرے ــــ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے[1]

(بقیہ صفحہ سابق) وہ ساعت آ گئی تو پھر نہ مہلت ہے نہ آزمائش، بلکہ وہ فیصلہ کا وقت ہے۔

[2] اس سوال کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وجوہ سے کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آثار قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامانِ عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس کو کتاب اور نبوت کی شمع دیکر دنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا اور پھر اس نے دنیا پرستی، نفاق، اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہٰذا جو گروہ اس قوم کے بعد امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے اُس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے تو وہ یہی قوم ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان ہی کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے، نہ اس لیے کہ ان کو حقیقت بتائی نہیں گئی تھی، بلکہ اس لیے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے انھیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا، اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

پھر کیا[1] تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گذرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گذریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتی کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ــــ اُس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ بھلائی کی راہ سے تم جو کچھ بھی خرچ کرو اپنے والدین، اقربا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے کرو، اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

تمھیں جنگ کا حکم دیدیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے ــــ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو

(بقیہ صفحہ سابق) ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور ایک نئی امت بنا دے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اُس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انھیں پھر سے ایک امت بنا دیں۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] اوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان ایک پوری داستان کی داستان ہے جسے ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ یہ آیت خود اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے، اور قرآن کی مکی سورتوں میں (جو سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہو ڈی تھیں) یہ داستان تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ انبیاء جب کبھی دنیا میں آئے اُنھیں اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انھوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلہ میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جد و جہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا کہ آمنّا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اس "آمنّا" کا قدرتی تقاضا ہر زمانہ میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے اُسے قائم کرنے کی کوشش کرے (باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ع ۶

لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو، اُس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور خود اس سے باز رہنا، مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور یہ فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے۔[1] وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر اُن کا بس چلے تو تمھیں اس دین سے پھیر لے جائیں، (اور یہ تمھارے لیے ایسا بڑا خطرہ ہے کہ) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھر جائیگا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔[2] بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے

(بقیہ صفحہ سابق) اور جوطاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] کفارِ مکہ اور یہودیوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ لوگ دعویٰ تو کرتے ہیں خدا پرستی کا مگر ماہِ حرام میں بھی لڑنے سے نہیں چوکتے۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے۔

[2] مسلمانوں میں سے بعض لوگ جن کے ذہن پر صلح پسندی کا ایک غلط تصور مسلط تھا کفارِ مکہ اور یہودیوں کے اعتراضات سے متاثر ہو گئے تھے۔ اس آیت میں انھیں سمجھایا گیا ہے کہ تم یہی ان باتوں سے یہ امید نہ رکھو کہ تمھارے اور اُن کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ اُن کا تم سے کوئی زن، زر، زمین کا جھگڑا تو ہے نہیں کہ کچھ لین دین پر صلح ہو جائے۔ اُن کو تو یہ بات کھلتی ہے کہ تم اس دین پر ایمان کیوں لائے ہو اور اس کی طرف دنیا کو دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو تمھارے اور ان کے درمیان صلح کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسے دشمنوں کو تم معمولی دشمن نہ سمجھو۔ جو تم سے مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے وہ کمتر درجہ کا دشمن ہے، مگر جو تمھیں دینِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے وہ تمھارا بدترین دشمن ہے، کیونکہ پہلا تو صرف تمھاری دنیا ہی خراب کرتا ہے لیکن یہ دوسرا تمھیں آخرت کے ابدی عذاب میں دھکیل دینے پر تُلا ہوا ہے۔

ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد[۵۱] کیا ہے وہ رحمتِ الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

پوچھتے ہیں شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں انسان کے لیے کچھ منافع بھی ہیں مگر ان کا نقصان اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے[۵۲]۔

پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو، جو کچھ بچا سکو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

پوچھتے ہیں یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے[۵۳]؟ کہو جس طرزِ عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی

---

۵۱ جہاد = کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو "قتال" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام امکانی وسائل اُس کو فروغ دینے میں صرف کر دے، اور ہر اُس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے حتیٰ کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے "جہاد"۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اِس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے، اِس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیشِ نظر نہ ہو۔

۵۲ یہ شراب اور جوے کے متعلق پہلا حکم ہے جس میں صرف اظہارِ ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی۔ پھر شراب اور جوے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو قطعی حرام کر دیا گیا۔

شراب کے لیے "خمر" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق اگرچہ عرفِ عام میں شراب ہی پر ہوتا ہے، لیکن اس کے حکم میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جو انسان کی قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ کو معطل کر کے اس کی باقی تمام قوتوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ شترِ بے مہار کی طرح جو چاہے کرے۔ اور "جوے" کا اطلاق ہر اُس معاملہ پر ہوتا ہے جس میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملہ میں تم پر سختی کرتا مگر وہ صاحب اختیار ہونے کے ساتھ صاحب حکمت بھی ہے۔

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ مشرک شریف زادی سے مومن لونڈی بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، مشرک شریف سے مومن غلام بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے[۱]۔ اُس نے اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں، شاید کہ وہ سبق لیں اور

(بقیہ سابق) ایک آدمی کا مال دوسرے آدمی کو محض بربنائے اتفاق ملتا ہے بغیر اس کے کہ لینے والا کسی تمدنی خدمت کی بنا پر اس کا مستحق ہو یا دینے والے کو اس مال کے معاوضہ میں کوئی تمدنی فائدہ حاصل ہو۔

[۱۰] قرآن میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا بار بار سختی کے ساتھ حکم دیا گیا تھا، یہاں تک فرمایا گیا کہ "یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو" اور یہ کہ "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں"۔ ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا اور اس احتیاط پر بھی انھیں ڈر تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان بچوں کے ساتھ ہمارے معاملہ کی صحیح صورت کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اوپر جو حکم دیا گیا تھا، اس آیت میں اس کی علت و مصلحت بیان کر دی گئی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ تعلق ہو تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آئندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرز زندگی کا نقش ثبت ہوگا، وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

ع ۲۸ نصیحت قبول کریں۔

پوچھتے ہیں حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو وہ ایک بیماری کی حالت ہے، اُس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں[۱۵]۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس جاؤ اُس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے[۱۶]۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی پسند کریں۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، تمہیں اختیار ہے جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ[۱۷]، مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو[۱۸] اور اللہ کی ناراضی سے بچو،

(بقیہ سابق) مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسلیں تک متاثر ہو جائیں گی۔ اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے ازدواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایسی ایک معجونِ مرکب اُس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متاثر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے تب بھی اُس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۵] قرآن مجید اس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے، اس لیے اس نے الگ رہو اور قریب نہ جاؤ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہنود اور بعض دوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ زن و شو سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

[۱۶] حکم سے مراد حکمِ فطری ہے جو انسان و حیوان سب کی جبلت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر متنفس بالطبع واقف ہے۔ (باقی حواشی صفحہ آئندہ پر)

خوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے۔ اور اے نبی جو تمھاری ہدایت کو مان لیں انھیں فلاح وسعادت کا مژدہ سنا دو۔

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔[۵۹] اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو[۶۰] ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو ان کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا، اللہ بہت درگذر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں اُن کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے،[۶۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۲) ۵۷ یعنی فطرۃ اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیرگاہ نہیں بنایا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں، اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

۵۸ جامع الفاظ ہیں جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمھارے دنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو اس کو دین، اخلاق اور آدمیت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرہ میں اس بات پر بھی تنبیہ فرما دی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً کوتاہی کی تو اللہ تم سے باز پرس کرے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۹ احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہو جائے کہ اس قسم کے توڑ دینے ہی میں خیر اور بھلائی ہے اسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ قسم توڑنے کا کفارہ آگے چل کر قرآن میں بیان ہوا ہے۔

۶۰ یعنی بطور تکیہ کلام کے بلا ارادہ جو قسمیں زبان سے نکل جاتی ہیں۔ ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اگر انھوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے[51]، اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو[52] تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[53]۔

(بقیہ صفحہ سابق) اور نہ اُن کا مواخذہ ہوگا۔

۵۰ اصطلاح شرع میں اس کو ایلا کہتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے، بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ ازدواج میں تو بندھے رہیں مگر عملاً ایک دوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینہ کی مدت مقرر کر دی کہ یا تو اس دوران میں اپنے تعلقات درست کر لو، ورنہ ازدواج کا رشتہ منقطع کر لو تاکہ دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں اس کے ساتھ نکاح کر لیں۔

آیت میں چونکہ "قسم کھا لینے" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لیے فقہائے حنفیہ اور شافعیہ نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلق زن و شو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا، تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو، اس آیت کا حکم اس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو، دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینہ کی مدت ہے اور ایک قول امام احمد کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔

حضرت علی اور ابن عباس کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترکِ تعلق کے لیے ہے جو بگاڑ کی وجہ سے ہو، رہا کسی مصلحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا جبکہ تعلقات خوشگوار ہوں، تو اس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے فقہاء کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کر دے، ایلاء ہے اور اُسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے، خواہ ناراضی سے ہو یا رضامندی سے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ بعض فقہاء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اس مدت کے اندر اپنی قسم توڑ دیں اور پھر سے تعلق زن و شو قائم کر لیں تو ان پر قسم توڑنے کا کفارہ نہیں ہے، اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا لیکن اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اسے قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ غفور رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارہ سے تمھیں معاف کر دیا گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمھارے کفارے کو قبول کر لے گا اور ترکِ تعلق کے دوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دوسرے پر کی ہو اسے معاف کر دیا جائے گا۔

۵۲ حضرت عثمان، ابن مسعود، زید بن ثابت وغیرہم کے نزدیک رجوع کا موقع چار مہینہ کے اندر ہی ہے، (باقی اگلے صفحہ پر)

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہو اسے چھپائیں، انھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے اگر وہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں تو وہ اِس عدت کے دوران میں انھیں پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں[۱]۔

(حواشی صفحہ سابق) اس مدت کا گذر جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، اس لیے مدت گذرتے ہی طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاق بائن ہو گی، یعنی دوران عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا البتہ اگر وہ دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمر، علی، ابن عباس اور ابن عمر سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے، اور فقہائے حنفیہ نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔ سعید ابن مسیب، مکحول، زہری وغیرہ حضرات اس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینے کی مدت گذر جانے کے بعد خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی، مگر ان کے نزدیک وہ ایک طلاق رجعی ہو گی، یعنی دوران عدت میں شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہو گا اور رجوع نہ کرے تو عدت گذر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں تو نکاح کر سکیں گے۔ بخلاف اس کے حضرت عائشہ، ابو الدرداء اور اکثر فقہائے مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدت گذر نے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہو گا اور حاکم عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت سے رجوع کرے یا اُسے طلاق دے۔ حضرت عمر، حضرت علی اور ابن عمر کا ایک قول اس کی تائید میں بھی ہے، اور امام مالک و شافعی نے اسی کو قبول کیا ہے۔

[۲] یعنی اگر تم نے بیوی کو ناروا بات پر چھوڑا ہے تو اللہ سے بے خوف نہ رہو، وہ تمھاری زیادتی سے واقف ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اصل میں لفظ "قرء" استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک قرء سے مراد حیض ہے اور اس رائے کے بموجب جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے اس وقت تک طلاق بائن نہ ہو گی اور شوہر کو رجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرت ابو بکر، عمر، علی، ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری، ابن مسعود اور بڑے بڑے صحابہ کی یہی رائے ہے اور فقہائے حنفیہ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اس کے دوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حق رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہ، ابن عمر، اور زید ابن ثابت کی ہے۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں، البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے، اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔

طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دیا جائے[۵]۔ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو، البتہ وہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے[۵۲]۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو لوگ حدودِ الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں ــــ پھر اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو رخصت کرنے ہی کا فیصلہ کیا اور تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی، الّا یہ کہ

(بقیہ صفحہ سابق) مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اس صورت سے متعلق ہے جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صورت میں شوہر کو حق رجوع نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عورت کو طُہر کی حالت میں ایک بار طلاق دی جائے، پھر دوسرے طُہر میں اگر چاہے تو ایک اور طلاق دے دے۔ اس صورت میں شوہر کو حق رہتا ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے جب چاہے رجوع کرلے، اور اگر عدت گذر بھی جائے تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کرلیں لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دی جائیں، تو یہ سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے، اور حضرت عمر سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۳۷ پر)

اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دیدے[۱] ، تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنھیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو یا بھلے طریقہ سے انھیں روک لو یا بھلے طریقہ سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا[۲]۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمتِ عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے اس کا احترام ملحوظ رکھو[۳]۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔

ع۲۹

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو پھر اس میں مانع

(بقیہ صفحہ سابق) [۱] اسی چیز کا نام خلع ہے، یعنی اگر عورت طلاق لینے کی خواہشمند ہو تو وہ شوہر کو کچھ دے کر طلاق حاصل کرلے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اُس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرلے کہ وہ نکاح کے بعد اُسے طلاق دیدے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی، اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔ لوگ پہلے تو اپنی حماقت سے بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں، پھر اس پر پچھتاتے ہیں اور سازشی طریقہ سے حلالہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دراصل گناہ در گناہ ہے۔

[۲] یعنی ایسا کرنا درست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدت گذرنے سے پہلے محض اس لیے رجوع کرلے کہ اسے پھر ستانے اور دق کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رجوع کرتے ہو تو اس نیت سے کرو کہ اب حسن سلوک سے رہنا ہے، ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقہ سے رخصت کر دو۔

[۳] یعنی اس حقیقت کو فراموش نہ کردو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیکر دنیا کی رہنمائی (باقی صفحہ آئندہ پر)

نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کرلیں جب کہ وہ معروف طریقہ سے باہم مناکحت پر راضی ہوں[۵]۔ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمہارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیئے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں[۶]۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقہ سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے ــــ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے[۷] ــــ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو وہ معروف طریقہ پر ادا کردو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم "امتِ وسط" بنائے گئے ہو تمہیں نیکی اور راستی کا گواہ بناکر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے روحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اٹھاؤ، اور دنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] یعنی اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہو اور زمانۂ عدت کے اندر اس سے رجوع نہ کیا ہو، پھر وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے کے لیے راضی ہوں تو عورت کے رشتہ داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت اس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو تو اس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

[۶] یہ اس صورت کا حکم ہے جبکہ زوجین ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہوں (خواہ طلاق کے ذریعہ سے یا خلع یا فسخ

(باقی صفحہ آئندہ پر)

تم میں سے جو لوگ مرجائیں اُن کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینہ دس دن روکے رکھیں[1]۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہوجائے تو انھیں اختیار ہے اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقہ سے جو چاہیں کریں، تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، اللہ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانہ عدت میں خواہ تم اُن بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارہ کنایہ میں ظاہر کردو، خواہ دل ہی میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی، مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا، اگر کوئی بات کرنی ہے تو معروف طریقہ سے کرو۔ اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہوجائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے لہٰذا اس سے ڈرو، اور یہ بھی جان لو
کہ اللہ بردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگذر فرماتا ہے۔ ع ۳۰

تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دیدو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے[2]۔ خوش حال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو لیکن مہر مقرر کیا جاچکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا، یہ اور

(بقیہ صفحہ سابق) وتفریق کے ذریعہ سے) اور عورت کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو۔

[3] یعنی اگر باپ مرجائے تو جو اس کی جگہ بچہ کا ولی ہو اُسے بھی یہ حق اسی طرح ادا کرنا چاہیے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یہ عدتِ وفات اُن عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی عدتِ وفات وضعِ حمل تک ہے خواہ وضعِ حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہوجائے یا اس میں کئی مہینے صرف ہوں۔

[2] اس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہرحال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مقدرت اس کی تلافی کرو۔

بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مہر نہ لے) یا وہ مرد جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے نرمی سے کام لے (اور پورا مہر دیدے)، اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو[۱]، تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو[۲]، خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو[۳]۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو تو خواہ پیدل ہو خواہ سوار

---

۱ یعنی انسانی تعلقات کی بہتری و خوشگواری کے لیے لوگوں کا باہم فیاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اڑا رہے تو اجتماعی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔

۲ قوانینِ تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اُسی نافرمانی کی رَو میں بہہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہہ نکلے۔

۳ اصل میں لفظ "صلوٰۃ وسطیٰ" استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد بعض مفسرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشاء۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا استنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملہ نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آگیا اور آپ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ خدا ان لوگوں کی قبریں اور ان کے گھر آگ سے بھر دے، انھوں نے ہماری صلوٰۃ وسطیٰ فوت کرادی۔ اس سے یہ سمجھا گیا کہ آپ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ فرمایا ہے۔ حالانکہ اس کا یہ مطلب زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجہ کی نماز ہم سے فوت کرادی، نا وقت پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خشوع و خضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وسطیٰ کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز بھی ہو سکتی ہے، اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کی ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ اللہ کے آگے فرمانبردار بندوں کی طرح کھڑے ہو، خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔ اور جب امن میسر آ جائے تو اللہ کو اُس طریقہ سے یاد کرو جو اُس نے تمہیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

تم میں سے جو لوگ[۱] وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں ان کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان ونفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملہ میں معروف طریقہ سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انہیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جانا چاہیے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمہیں صاف صاف بتاتا ہے۔ اُمید ہے کہ تم سمجھ بوجھ کر کام کرو گے۔ ع ۳۱

تم نے[۲] ان لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟[۳] اللہ نے اُن سے فرمایا مر جاؤ۔ پھر اُس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی

[۱] سلسلۂ تقریر اوپر ختم ہو چکا تھا، یہ کلام اس کے تتمہ اور ضمیمہ کے طور پر ہے۔

[۲] یہاں سے ایک دوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کو راہ خدا میں جہاد اور مالی قربانیاں کرنے پر اُبھارا گیا ہے اور انہیں ان کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جن کی وجہ سے آخرکار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان اس وقت تک مکے سے جا چکے تھے، سال ڈیڑھ سال سے مدینہ میں پناہ گزیں تھے، اور کفار کے مظالم سے تنگ آ کر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔ مگر جب انہیں لڑائی کا حکم دیدیا گیا تو اب ان میں سے بعض لوگ کسمسا رہے تھے جیسا کہ چھبیسویں رکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ اس لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے انہیں عبرت دلائی گئی ہے۔

[۳] یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰ نے ان کو حکم دیا کہ کنعانی ظالموں کو ارض

(باقی اگلے صفحے پر)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے[۱] تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔

پھر تم نے اُس معاملہ پر بھی غور کیا جو موسیٰ کے بعد سرداران بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ انھوں نے اپنے نبی سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔[۲] نبی نے پوچھا

(بقیہ صفحہ سابق) فلسطین سے نکال دو اور اس علاقہ کو فتح کر لو تو انھوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ایک نسل ختم ہو گئی اور دوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اٹھی تب اللہ تعالیٰ نے انھیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملہ کو موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] "قرض حسن"، لفظی ترجمہ "اچھا قرض"۔ یعنی ایسا قرض جو خالص نیکی کے جذبہ سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جائے، اللہ اس کو اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے اور یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرض حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

[۲] یہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عمالقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اُس زمانہ میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے سرداران بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا سردار ہو جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آ چکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور پادشاہی کا فرق اُن کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں بلکہ ایک پادشاہ کے تقرر کی تھی۔ اس سلسلہ میں بائیبل کی کتاب سموئیل اول میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲) "سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا ۔۔۔۔ تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے کہ دیکھ تو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے ۔۔۔۔ یہ بات سموئیل کو بُری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں تو اس کو مان کیونکہ انھوں نے تیری نہیں بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اُن کا بادشاہ نہ رہوں ۔۔۔ اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کریگا اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالہ میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمھاری بیٹیوں کو گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمتگاروں کو عطا کرے گا اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے جسے تم نے اپنے لیے چنا ہو گا فریاد کرو گے پر اُس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تا کہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے ۔۔۔ خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو اُن کی بات مان لے اور اُن کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔"

(باب ۷ آیت ۱۵ تا باب ۸ آیت ۲۲)

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا ۔۔۔ جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمھارا خدا تمھارا بادشاہ تھا۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم

(باقی اگلے صفحہ پر)

کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوتؑ کو تمھارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلہ میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے"۔ نبی نے جواب دیا "اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں، اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے"۔ اس کے ساتھ اُن کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمھیں واپس مل جائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، اور

(بقیہ صفحہ سابق) اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا..... اور تم جان لوگے اور دیکھ بھی لوگے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے سے کتنی بڑی شرارت کی ..... اب رہا میں، سو خدا نہ کرے کہ تمھارے لیے دعا کرنے سے باز آکر خداوند کا گنہگار ٹھیروں، بلکہ میں وہی راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تم کو بتاؤں گا" (باب ۱۲، آیت ۱۲ تا ۲۳)

کتاب سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ، اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں اس مقام پر سردارانِ بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی مذمت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قصہ کا ذکر جس غرض کے لیے کیا ہے اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بزدل ہو گئے تھے اور ان میں کس قدر نفسانیت آگئی تھی اور ان کے اندر اخلاقی انضباط کی کتنی کمی تھی جس کے سبب سے آخرکار وہ گر گئے، اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو اِس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں[۵۱]۔ اگر تم مومن ہو تو یہ تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔" ع۲

پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو اس نے کہا ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا وہ میرا ساتھی نہیں، میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے، ہاں ایک آدھ چلّو کوئی پی لے تو پی لے۔ مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے[۵۲]۔

(بقیہ صفحہ سابق) [۵۰] بائیبل میں اس کا نام "ساؤل" لکھا ہے اور اس کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ "بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زیادہ خوبصورت کوئی شخص نہ تھا اور وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔"

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] بائیبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے تاہم اس سے اصل واقعہ کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق جس میں تبرکات محفوظ تھے فلسطینی مشرکین نے ایک لڑائی کے موقع پر بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا، لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ آخر کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالباً اسی معاملہ کی طرف قرآن ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اُسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ "اس صندوق میں تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے" تو بائیبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آ گئے ہیں۔ پس اُس صندوق کا واپس آنا اِس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

[۵۲] غالباً دریائے اردن مراد ہے جس کے مغرب میں فلسطین اور مشرق میں شرق اردن واقع ہے۔ بنی اسرائیل اس وقت شکست کھا کر شرق اردن کی طرف ہٹ گئے تھے۔ اب طالوت انھیں لے کر دریا کے مغربی کنارے کی طرف اترنا چاہتا تھا، مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے اس لیے اس نے کارآمد اور ناکارہ لوگوں کو تمیز کرنے کے لیے یہ آزمائش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کرکے آگے بڑھے تو انھوں نے طالوت سے کہدیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔[1] لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انھوں نے کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے"۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ پر نکلے تو انھوں نے دعا کی "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر"۔ آخر کار اللہ کے اذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا، اور داؤد[2] نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا اُس کو علم دیا ــــ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا،[3] لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔

(بقیہ صفحہ سابق) ان پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دشمن کے مقابلہ میں پا مردی دکھائیں گے جس سے پہلے ہی شکست کھا چکے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ کہنے والے وہی تھے جنھوں نے دریا پر پہلے ہی اپنی بے صبری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

[2] داؤد علیہ السلام اُس وقت ایک کم سن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے جبکہ فلسطیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان "جالوت" (جولیت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلہ کو نکلے۔ حضرت داؤد یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلہ پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے انھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا، طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے۔

[3] یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حد خاص تک زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے اور جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے تو کسی دوسرے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنا رہے ہیں اور تم یقیناً ان لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے، ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہمکلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روحِ پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں کے بعد، جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے، مگر اللہ کی مشیت یہ نہ تھی، (اسی لیے) لوگوں میں اختلاف ہوا کہ کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر اختیار کیا۔ ہاں، اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے[ل]۔ ع ۳۲

(بقیہ صفحۂ سابق) گروہ کے ذریعہ سے اللہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی تو یقیناً ملکِ خدا میں فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا[ل]) مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے آنے کے بعد جو لوگوں میں اختلافات ہوئے، کوئی ایمان لایا کوئی نہ لایا، اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک نوبتیں پہنچیں، تو یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اللہ بے بس تھا، اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا۔ نہیں، اگر اللہ چاہتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاء کی دعوت سے منہ موڑ سکتا اور کفر و بغاوت کی راہ پر چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کر سکتا۔ مگر اللہ کی مشیت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لی جائے، اور انہیں ایک خاص روش پر چلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ اس نے امتحان کی غرض سے انہیں اعتقاد و عمل کی راہوں میں انتخاب کی آزادی عطا کی ہے، اور انبیاء کو لوگوں کو کوتوال بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ زبردستی انہیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ دلائل اور بینات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوتے وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کر لیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا مگر معاذ اللہ اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

اے ایمان لانے والو جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو[۵۱] قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی، ظالم اصل میں وہ جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں[۵۲]۔

[۵۱] مراد راہِ خدا میں صرف کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے انھیں اس مقصد کے لیے جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

[۵۲] کفر کی روش اختیار کرنے والوں سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو اس حکم کی اطاعت سے انکار کریں اور اپنے مال کو خدا کی خوشنودی سے عزیز تر رکھیں، یا وہ لوگ ہیں جو اس دن پر اعتقاد نہ رکھیں یا یہ سمجھیں کہ وہاں نجات خرید نے کا یا دوستی و سفارش سے کام نکال لینے کا کوئی موقع ہوگا۔

مقالات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(۵)

عبادت

لغوی تحقیق عربی زبان میں عبودۃ، عبودیۃ اور عبدیۃ کے اصل معنی خضوع اور تذلل کے ہیں، یعنی تابع ہوجانا، رام ہوجانا، کسی کے سامنے اس طرح سپر ڈال دینا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف وسرتابی نہ ہو اور وہ اپنے منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے اہل عرب اُس اونٹ کو بعیر معبّد کہتے ہیں جو سواری کے لیے پوری طرح رام ہوچکا ہو اور اس راستے کو طریق معبّد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہوکر ہموار بن گیا ہو۔ پھر اسی اصل سے اس مادہ میں غلامی، اطاعت، پوجا، ملازمت اور قید بارکاوٹ کے مفہومات پیدا ہوئے ہیں چنانچہ عربی لغت کی سب سے بڑی کتاب "لسان العرب" میں اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) العبد المملوک، خلاف الحُرّ۔ عبد وہ ہے جو کسی کی ملک ہو اور یہ لفظ حُرّ (آزاد) کی ضد ہے۔ تعبّد الرجل "آدمی کو غلام بنا لیا یا اس کے ساتھ غلام جیسا معاملہ کیا" یہی معنی عبّدہ، اَعبدہ، اور اعتبدہ کے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے ثلثۃ انا خصمھم، رجل اعتبد محرّرًا (وفی روایۃ اعبد محررًا) یعنی تین آدمی ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں مستغیث ہوں گا، من جملہ ان کے ایک وہ شخص ہے جو کسی آزاد کو غلام بنائے یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر اس سے غلام کا سا معاملہ کرے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا تھا وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ "اور تیرا وہ احسان جس کا طعنہ تو مجھے دے رہا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔"

(۲) العبادۃ الطاعۃ مع الخضوع، "عبادت اس اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری فرمانبرداری کے ساتھ ہو"۔ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ اے اطاعہ، "طاغوت کی عبادت کی یعنی اس کا فرمانبردار ہو گیا"۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ ای نطیع الطاعۃ التی یخضع معھا، "ہم تیری عبادت کرتے ہیں یعنی ہم تیری اطاعت پوری فرمانبرداری کے ساتھ کرتے ہیں"۔ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ای اطیعوا ربکم "اپنے رب کی عبادت کرو یعنی اس کی اطاعت کرو"۔ قَوْمُھُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ ای دائنون وکل من دان لملك فھو عابد لہ وقال ابن الانباری فلان عابد وھو الخاضع لربہ المستسلم المنقاد لامرہ، یعنی فرعون نے جو یہ کہا تھا کہ موسیٰ اور ہارون کی قوم ہماری عابد ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری تابع فرمان ہے، جو شخص کسی بادشاہ کا مطیع ہے وہ اس کا عابد ہے، اور ابن الانباری کہتا ہے کہ فلان عابد کے معنی ہیں "وہ اپنے مالک کا فرمانبردار اور اس کے حکم کا مطیع ہے"۔

(۳) عَبَدَہ عبادۃً ومعبداً ومعبدۃً تألّہ لہ "اس کی عبادت کی، یعنی اس کو پوجا"۔ التعبد التنسك، "تعبُّد سے مراد ہے کسی کا پرستار پجاری بن جانا"۔ شاعر کہتا ہے اری المال عند الباخلین معبّدا، "میں دیکھتا ہوں کہ بخیلوں کے ہاں روپیہ پُجتا ہے"۔

(۴) عَبِدَ بہ وعَبِدَ بہ لزمہ فلم یفارقہ، "عَبِدَہ اور عَبِدَ بہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور جدا نہ ہوا، اس کا دامن تھام لیا اور چھوڑا نہیں"۔

(۵) ما عبدك عنی ای ما حبسك، جب کوئی شخص کسی کے پاس آنے سے رُک جائے تو وہ یوں کہے گا کہ ما عَبَدَكَ عنّی، یعنی کس چیز نے تجھے میرے پاس آنے سے روک دیا۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادۂ عبد کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت چھوڑ دینا اور اُس کے لیے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی و غلامی کی ہے، لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا

ہوتا ہے وہ بندگی وغلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصل کام اپنے آقا کی اطاعت و فرماں برداری ہے اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور جبکہ ایک غلام اپنے آقا کی بندگی واطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو اور اس کی مہربانیوں پر شکر واحسانمندی کے جذبہ سے بھی سرشار ہو تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرتا ہے، مختلف طریقوں سے اعترافِ نعمت کا اظہار کرتا ہے، اور طرح طرح سے مراسم بندگی بجالاتا ہے۔ اسی کا نام پرستش ہے اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ رہے باقی دو تصورات تو وہ دراصل عبدیت کے ضمنی تصورات ہیں، اصلی اور بنیادی نہیں ہیں۔

لفظ عبادت کا استعمال قرآن میں

اس لغوی تحقیق کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پاک میں یہ لفظ تمام تر پہلے تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں معنی اول و دوم ایک ساتھ مراد ہیں، کہیں صرف معنی دوم اور کہیں صرف معنی سوم مراد لیے گئے ہیں، اور کہیں تینوں معنی بیک وقت مقصود ہیں۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

عبادت بمعنی غلامی واطاعت

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَکَانُوۡا قَوۡمًا عَالِیۡنَ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ (المومنون ۔ ۳)	پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور صریح دلیل ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا مگر وہ تکبر سے پیش آئے کیونکہ وہ باقتدار لوگ تھے، انھوں نے کہا کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری عابد ہے۔
وَتِلۡکَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (الشعراء)	(فرعون نے جب موسیٰ کو طعنہ دیا کہ ہم نے تجھے اپنے ہاں بچپن پالا ہے تو موسیٰ نے کہا) اور تیرا وہ احسان جس کا تو مجھے طعنہ

دے رہا ہے یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنا لیا۔

دونوں آیتوں میں عبادت سے مراد غلامی اور اطاعت و فرماں برداری ہے۔ فرعون نے کہا کہ موسیٰ اور ہارون کی قوم ہماری عابد ہے۔ یعنی ہماری غلام اور ہمارے فرمان کی تابع ہے۔ اور حضرت موسیٰ نے کہا کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنا لیا ہے۔ یعنی ان کو غلام بنا لیا ہے اور ان سے من مانی خدمت لیتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ (البقرہ - ۲۱)	اے ایمان لانے والو اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو تو ہم نے جو پاک چیزیں تمھیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔

اس آیت کا موقع و محل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام اور اپنے آبا و اجداد کے اوہام کی پیروی میں کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق طرح طرح کی قیود کی پابندی کرتے تھے جب ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو تو ان ساری پابندیوں کو ختم کر دو اور جو کچھ ہم نے حلال کیا ہے اسے حلال سمجھ کر بے تکلف کھاؤ پیو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے پنڈتوں اور بزرگوں کے نہیں بلکہ ہمارے بندے ہو، اور اگر تم نے واقعی اُن کی اطاعت و فرماں برداری چھوڑ کر ہماری اطاعت و فرماں برداری قبول کی ہے تو اب تمھیں حلت و حرمت اور جواز اور عدم جواز کے معاملہ میں اُن کے بنائے ہوئے ضابطوں کے بجائے ہمارے ضابطہ کی پیروی کرنی ہوگی۔ لہٰذا یہاں بھی عبادت کا لفظ غلامی اور اطاعت ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ (المائدہ ۹)	کہو، میں بتاؤں تمھیں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا انجام کن لوگوں کا ہے؟ وہ جن پر اللہ کی پھٹکار ہوئی اور اس کا غضب ٹوٹا جن میں سے بہت لوگ بندر اور سور تک بنا دیے گئے، جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل - ۵)	ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر یہ تعلیم دینے کے لیے بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے باز رہو۔
وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ (الزمر - ۲)	اور خوشخبری ہے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے طاغوت کی عبادت چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کیا۔

تینوں آیتوں میں طاغوت کی عبادت سے مراد طاغوت کی غلامی اور اطاعت ہے جیسا کہ آگے چل کر اسی سلسلہ کے مضامین میں بہ تشریح بیان ہوگا، قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد ہر وہ ریاست و اقتدار، اور ہر وہ رہنمائی و پیشوائی ہے جو خدا سے باغی ہو کر خدا کی زمین میں اپنا حکم چلائے اور اس کے بندوں کو زور و جبر سے یا تحریص و اطماع سے یا گمراہ کن تعلیمات سے اپنا تابع امر بنائے۔ ایسے ہر اقتدار اور ایسی ہر پیشوائی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اور اس کی بندگی اختیار کر کے اس کا حکم بجا لانا طاغوت کی عبادت ہے۔

عبادت بمعنی فرماں برداری | اب ان آیات کو لیجیے جن میں عبادت کا لفظ صرف معنی دوم میں استعمال ہوا ہے:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (یٰس - ۴)	اے بنی آدم کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے؟

ظاہر ہے کہ شیطان کی پرستش تو دنیا میں کوئی بھی نہیں کرتا، بلکہ ہر طرف سے اس پر لعنت و پھٹکار ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا بنی آدم پر جو فردِ جرم اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز لگائی جائیگی وہ اس بات کی نہ ہوگی کہ انھوں نے شیطان کو پوجا، بلکہ اس بات کی ہوگی کہ وہ شیطان کے کہے پر چلے اور اس کے احکام کی اطاعت کی اور جس جس راستہ کی طرف وہ اشارہ کرتا گیا اُس پر دوڑے چلے گئے۔

أُحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ... وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ	(جب قیامت برپا ہوگی تو اللہ فرمائے گا) تمام ظالموں اور اُن کے ساتھیوں کو اور اُن معبودانِ غیر اللہ کو جن کی عبادت کی جاتی تھی جمع کرو اور انھیں جہنم کا راستہ دکھاؤ ..... پھر وہ

بَعْضٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ قَالُوْا إِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَأْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ (الصّٰفّٰت - ۲)

آپس میں ایک دوسرے سے ردوکد کرنے لگیں گے۔ عبادت کرنے والے کہیں گے کہ تم ہی لوگ تو ہو جو خیر کی راہ سے ہمارے پاس آتے تھے۔ ان کے معبود جواب دیں گے کہ اصل میں تو تم خود ایمان لانے پر تیار نہ تھے، ہمارا کوئی زور تم پر نہیں تھا، تم آپ ہی نافرمان لوگ تھے۔

اس آیت میں عابدوں اور معبودوں کے درمیان جو سوال و جواب نقل کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بُت اور دیوتا نہیں ہیں جن کی پوجا کی جاتی تھی، بلکہ وہ پیشوا اور رہنما ہیں جنھوں نے خیر طلب بن کر انسانوں کو گمراہ کیا، جو تقدس کے جامے پہن کر نمودار ہوئے، جنھوں نے سجادوں اور تسبیحوں اور جُبّوں اور گلیموں سے بندگانِ خدا کو دھوکا دے کر اپنا معتقد بنایا، جنھوں نے اصلاح اور خیر خواہی کے دعوے کر کے شر اور فساد پھیلائے۔ ایسے لوگوں کی اندھی تقلید اور ان کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرنے ہی کو یہاں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا (التوبہ - ۵)

انھوں نے اپنے علما اور مشائخ کو خدا کے بجائے اپنا رب بنا لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک الٰہ کے سوا کسی کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

یہاں علما اور مشائخ کو رب بنا کر ان کی عبادت کرنے سے مراد ان کو امر و نہی کا مختار ماننا اور خدا و پیغمبرِ خدا کی سند کے بغیر ان کے احکام کی اطاعت بجا لانا ہے۔ اسی معنی کی تصریح روایاتِ صحیحہ میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے جب آپ سے عرض کیا گیا کہ ہم نے اپنے علما اور مشائخ کی پرستش تو کبھی نہیں کی تو آپ نے جواب دیا کہ جس چیز کو انھوں نے حلال ٹھیرایا، کیا تم نے اسے حلال نہیں سمجھ لیا؟ اور جسے انھوں نے حرام قرار دیا کیا تم نے اسے حرام نہیں مان لیا؟

عبادت بمعنی پرستش اب تیسرے معنی کی آیات لیجیے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن کی رو سے عبادت بمعنی پرستش میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک یہ کہ کسی کے لیے سجدہ و رکوع اور دست بستہ قیام اور طواف اور آستانہ بوسی اور نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ کے وہ مراسم ادا کیے جائیں جو بالعموم پرستش کی غرض سے ادا کیے جاتے ہیں قطع نظر اس سے کہ اسے مستقل بالذات معبود سمجھا جائے یا بڑے معبود کے ہاں تقرب اور سفارش کا ذریعہ سمجھ کر ایسا کیا جائے یا بڑے معبود کے ماتحت خدائی کے انتظام میں شریک سمجھتے ہوئے یہ حرکت کی جائے، دوسرے یہ کہ کسی کو عالم اسباب پر ذی اقتدار خیال کر کے اپنی حاجتوں میں اس سے دعا مانگی جائے، اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں میں اس کو مدد کے لیے پکارا جائے اور خطرات و نقصانات سے بچنے کے لیے اس سے پناہ مانگی جائے۔ یہ دونوں قسم کے فعل قرآن کی رو سے یکساں پرستش کی تعریف میں آتے ہیں:

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ (المومن - ۷)	کہو، مجھے تو اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ اپنے رب کی طرف سے صریح ہدایات پا لینے کے بعد میں اُن کی پرستش کروں جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔
وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ... فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ .... (مریم - ۳) ان سب سے الگ ہو گیا تو ہم نے اُسے اسحٰق جیسا بیٹا دیا....	(ابراہیم نے کہا) میں تم کو اور اللہ کے ماسوا جنھیں تم پکارتے ہو ان سب کو چھوڑتا ہوں اور اپنے رب کو پکارتا ہوں ... پس جب وہ ان سے اور اللہ کے سوا جن کی وہ عبادت کرتے تھے
وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا	اور اس سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر انھیں پکارے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے جنھیں خبر تک نہیں کہ اُن کو پکارا جا رہا ہے، اور جو روز حشر میں (جبکہ سب لوگ جمع کیے جائیں گے) اپنے ان پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا انکار

بِعِبَادَتِهِمْ کَافِرِیْنَ (احقاف - ۱)	کریں گے[1]

تینوں آیتوں میں قرآن نے خود ہی تصریح کر دی ہے کہ یہاں عبادت سے مراد دعا مانگنا اور مدد کے لیے پکارنا ہے۔

بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَکْثَرُھُمْ بِھِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا - ۵)	بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر ان پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

یہاں جنوں کی عبادت اور اُن پر ایمان لانے سے جو کچھ مراد ہے، اس کی تشریح سورۂ جن کی یہ آیت کرتی ہے:

وَاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (رکوع - ۱)	اور یہ کہ انسانوں میں سے بعض اشخاص جنوں میں سے بعض اشخاص کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کی عبادت سے مراد ان کی پناہ ڈھونڈنا اور خطرات و نقصانات کے مقابلہ میں اُن سے حفاظت طلب کرنا ہے، اور ان پر ایمان لانے سے مراد ان کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ وہ پناہ دینے اور حفاظت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

یَوْمَ یَحْشُرُھُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ ھٰٓؤُلَآءِ اَمْ ھُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ؟ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ مَا کَانَ یَنْبَغِیْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِکَ مِنْ اَوْلِیَآءَ (الفرقان - ۲)	جس روز اللہ ان کو اور ان کے اُن معبودوں کو جمع کرے گا جن کی یہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو وہ اُن سے پوچھے گا کہ میرے ان بندوں کو تم نے بہکایا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بہک گئے؟ وہ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! ہم کو کب زیبا تھا کہ حضور کو چھوڑ کر ہم کسی کو ولی و مددگار بنائیں۔

یہاں اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معبودوں سے مراد اولیاء، انبیاء اور صلحاء ہیں اور

[1] یعنی صاف کہیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کہا کہ ہماری عبادت کرو، اور نہ ہمیں اس کی کبھی خبر ہوئی کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

ان کی عبادت سے مراد اُن کو بندگی کی صفات سے بالاتر اور خدائی کی صفات سے متصف سمجھنا، ان کو غیبی امداد اور مشکل کشائی و فریاد رسی پر قادر خیال کرنا، اور ان کے لیے تعظیم کے وہ مراسم ادا کرنا ہے جو پرستش کی حد تک پہنچے ہوئے ہوں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ (سبا - ۵)	جس روز اللہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا وہ تم ہی کو یہ لوگ عبادت کرتے تھے؟ تو وہ کہیں گے سبحان اللہ ہمیں ان سے کیا تعلق، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے۔

یہاں فرشتوں کی عبادت سے مراد ان کی پرستش ہے جو ان کے استھان اور ہیکل اور خیالی مجسمے بنا کر کی جاتی تھی اور اس پوجا سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ ان کو خوش کر کے ان کی نظر عنایت اپنے حال پر مبذول کرائی جائے اور اپنے دنیوی معاملات میں ان سے مدد حاصل کی جائے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَاءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (یونس - ۲)	وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔
وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهٖٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر - ۱)	جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنا رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

یہاں بھی عبادت سے مراد پرستش ہے اور اس غرض کی بھی تشریح کر دی گئی ہے جس کے لیے یہ پرستش کی جاتی تھی۔

عبادت بمعنی بندگی واطاعت و پرستش ان مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں عبادت کا لفظ کہیں غلامی و اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، کہیں مجرد اطاعت کے معنی میں اور کہیں پرستش کے معنی

ہیں۔ اب قبل اس کے کہ ہم وہ مثالیں پیش کریں جن میں لفظ عبادت ان تینوں مفہومات کا جامع ہے، ایک مقدمہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اوپر جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سب میں اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کا ذکر ہے۔ جہاں عبادت سے مراد غلامی و اطاعت ہے وہاں معبود یا تو شیطان ہے، یا وہ باغی انسان ہیں جنھوں نے طاغوت بن کر خدا کے بندوں سے خدا کے بجائے اپنی بندگی و اطاعت کرائی، یا وہ رہنما و پیشوا ہیں جنھوں نے کتاب اللہ سے بے نیاز ہو کر اپنے خود ساختہ طریقوں پر لوگوں کو چلایا۔ اور جہاں عبادت سے مراد پرستش ہے وہاں معبود یا تو انبیاء، اولیاء اور صلحاء ہیں جنھیں ان کی تعلیم و ہدایت کے خلاف معبود بنا یا گیا، یا فرشتے اور جن ہیں جن کو محض غلط فہمی کی بنا پر فوق الطبعی ربوبیت میں شریک سمجھ لیا گیا، یا خیالی طاقتوں کے بُت اور تماثیل ہیں جو محض شیطانی اغوا سے مرکز پرستش بن گئے۔ قرآن ان تمام اقسام کے معبودوں کو باطل اور ان کی عبادت کو غلط ٹھیراتا ہے، خواہ ان کی غلامی کی گئی ہو یا اطاعت یا پرستش۔ وہ کہتا ہے کہ تمھارے یہ سب معبود جن کی تم عبادت کر رہے ہو اللہ کے بندے اور غلام ہیں، نہ انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ ان کی عبادت سے بجز نامرادی اور ذلت و رسوائی کے تم کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں ان کا اور ساری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے، اسی کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہیں، لہٰذا عبادت کا مستحق اکیلے اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔۔۔ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (اعراف - ۲۴)	اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم خود بندے ہو۔ انھیں پکار کر دیکھ لو، اگر تمھارا عقیدہ ان کے بارے میں صحیح ہے تو وہ تمھاری پکار کا جواب دیں۔۔۔۔ اللہ کے ماسوا جنھیں تم پکارتے ہو وہ نہ تمھاری کوئی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی مدد پر قادر ہیں۔
وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ،	یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے؛ وہ بالاتر

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء - ۲)	ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ جنھیں یہ اس کی اولاد کہتے ہیں وہ دراصل اس کے بندے ہیں جن کو عزت دی گئی ہے۔ ان کی اتنی مجال نہیں کہ خود سبقت کر کے اللہ کے حضور کچھ عرض کر سکیں بلکہ جیسا وہ حکم دیتا ہے اُسی کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ

جانتے ہیں اُسے بھی اللہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے پوشیدہ ہے اس کی بھی اللہ کو خبر ہے۔ وہ اللہ کے حضور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے بجز اُس کے جس کی سفارش خود اللہ ہی قبول کرنا چاہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے سہمے رہتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (زخرف - ۲)	اِن لوگوں نے فرشتوں کو جو دراصل رحمٰن کے بندے ہیں دیویاں بنا رکھا ہے۔
وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (صٰفٰت - ۵)	انھوں نے جنوں کے اور خدا کے درمیان نسبی رشتہ فرض کر لیا ہے حالانکہ جن خود بھی جانتے ہیں کہ ایک روز انھیں حساب

کے لیے اس کے حضور پیش ہونا ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (النساء - ۲۴)	نہ مسیح نے کبھی اس کو اپنے لیے عار سمجھا کہ وہ اللہ کا عبد ہو اور نہ مقرب فرشتوں نے۔ اور جو کوئی اُس کی بندگی وغلامی میں عار سمجھے اور تکبر کرے (وہ بھاگ کر جا کہاں سکتا ہے) ایسے سب لوگوں کو اللہ اپنے حضور کھینچ بلائے گا۔
اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (الرحمٰن - ۱)	سورج اور چاند سب گردش میں لگے ہیں اور تارے اور درخت سب خدا کے آگے سرِ اطاعت جھکائے ہوئے ہیں۔
تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ	ساتوں آسمان اور زمین اور جس قدر موجودات آسمان و زمین میں ہیں سب کے سب اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل ۔ ۵)	جو حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو، مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔
وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (الروم ۔ ۳)	آسمانوں اور زمین کی کل موجودات اس کی ملک ہے اور ساری چیزیں اس کے فرمان کی تابع ہیں۔
مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۔ (ہود ۔ ۵)	کوئی جاندار ایسا نہیں جو اللہ کے قبضۂ قدرت میں جکڑا ہوا نہ ہو۔
اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (مریم ۔ ۶)	زمین اور آسمانوں کے باشندوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو رحمٰن کے سامنے غلام کی حیثیت سے پیش ہونے والا نہ ہو۔ اس نے سب کا شمار کر رکھا ہے اور قیامت کے روز سب اس کے حضور فرداً فرداً پیش ہوں گے۔
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران ۔ ۳)	کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس طرح اُن سب کو جن کی عبادت کسی شکل میں کی گئی ہے، اللہ کا غلام اور بے اختیار ثابت کر دینے کے بعد قرآن تمام جن و انس سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مفہوم کے لحاظ سے عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے، غلامی ہو تو اس کی، اطاعت ہو تو اس کی، پرستش ہو تو اُس کی، ان میں سے کسی نوع کی عبادت کا بھی شائبہ تک غیر اللہ کے لیے نہ ہو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۔ ۵)	ہم نے ہر قوم میں ایک رسول یہی پیغام دے کر بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (الزمر ـ ۲)	خوشخبری ہے ان کے لیے جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے پرہیز کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔
اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (یٰسٓ ـ ۴)	اے بنی آدم کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، اور میری عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔
اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ .... وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (التوبہ ـ ۵)	انھوں نے اللہ کے بجائے اپنے علماء و مشائخ کو اپنا رب بنا لیا .... حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک الٰہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (بقرہ ـ ۲۱)	اے ایمان لانے والو! اگر تم نے واقعی ہماری ہی عبادت اختیار کی ہے تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو۔

ان آیات میں اللہ کے لیے اُس عبادت کو مخصوص کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو بندگی و غلامی اور اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں ہے، اور اس کے لیے صاف قرینہ موجود ہے کہ طاغوت اور شیطان اور احبار و رہبان اور آبا و اجداد کی اطاعت و بندگی سے پرہیز کر کے اللہ کی اطاعت و بندگی اختیار کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المومن ـ ۷)	کہو مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح ہدایات پا لینے کے بعد اُن کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے بجائے پکارتے ہو، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العٰلمین کے آگے سر تسلیم خم کر دوں۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (المومن — ۶)	اور تمھارے ربّ نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری پکار کا جواب دوں گا، اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ یقیناً جہنم میں جھونکے جائیں گے۔
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ (فاطر — ۲)	وہی اللہ تمھارا رب ہے، بادشاہی اُسی کی ہے، اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو ان کے اختیار میں ذرہ برابر کچھ نہیں، تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار سُن نہیں سکتے اور سُن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمھارے اس شرک کا انکار کریں گے۔
قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (المائدہ — ۱۰)	کہو، کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں نہ نفع پہنچانے کی؟ سب کچھ سننے اور جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔

ان آیات میں اس عبادت کو اللہ کے لیے مخصوص کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو پرستش کے معنی میں ہے، اور اس کے لیے بھی صاف قرینہ موجود ہے کہ عبادت کو دعا کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے اور ماقبل و مابعد کی آیات میں اُن معبودوں کا ذکر پایا جاتا ہے جنھیں فوق الطبعی ربوبیت میں اللہ کا شریک قرار دیا جاتا تھا۔

اب کسی صاحب بصیرت آدمی کے لیے یہ سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جہاں جہاں قرآن میں اللہ کی عبادت کا ذکر ہے اور آس پاس کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جو لفظ عبادت کو اس کے مختلف مفہومات میں سے کسی ایک مفہوم کے لیے خاص کرتا ہو، ایسے تمام مقامات میں عبادت سے مراد غلامی، اطاعت اور پرستش تینوں مفہوم ہوں گے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات کو دیکھیے:

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (طٰہٰ - ۱)	میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں لہٰذا تو میری ہی عبادت کر۔
ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْہُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ (انعام - ۱۳)	وہی اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر شے کی خبر گیری کا متکفل ہے۔
قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ اَعْبُدُ اللّٰہَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (یونس - ۱۱)	کہو کہ لوگو! اگر تمہیں ابھی تک تحقیق معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے، اور مجھے حکم دیا

گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاؤں۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف - ۵)	اللہ کے ماسوا جن کی تم عبادت کرتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی دلیلِ معبودیت نازل نہیں کی ہے، اقتدار صرف اللہ کے لیے خاص ہے، اس

نے حکم دیا ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، یہی سیدھا طریقہ ہے۔

وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ فَاعْبُدْہُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ (ہود - ۱۰)	آسمانوں اور زمین کی جس قدر حقیقتیں بندوں سے پوشیدہ ہیں اُن کا علم اللہ ہی کو ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف

میں پیش ہوتے ہیں، لہٰذا تو اسی کی عبادت کر اور اُسی پر بھروسہ رکھ۔

لَہٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ	جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہم سے پوشیدہ ہے

ذَالِكَ، وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا، رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (مریم - ۴)	اور جو کچھ ان دونوں حالتوں کے درمیان ہے، سب کا مالک وہی ہے، اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے، وہ مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین

کے درمیان ہیں۔ لہٰذا تو اُسی کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہ۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ أَحَدًا (کہف - ۱۲)	پس جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔

کوئی وجہ نہیں کہ ان آیات اور ایسی ہی دوسری تمام آیات میں عبادت کے لفظ کو محض پرستش یا محض بندگی و اطاعت کے لیے مخصوص ٹھیرا لیا جائے۔ اس طرح کی آیات میں دراصل قرآن اپنی پوری دعوت کو پیش کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآن کی دعوت یہی ہے کہ بندگی، اطاعت، پرستش جو کچھ بھی ہو اللہ کی ہو۔ لہٰذا ان مقامات پر عبادت کے معنی کو کسی ایک مفہوم میں محدود کرنا حقیقت میں قرآن کی دعوت کو محدود کرنا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کی دعوت کا ایک محدود تصور لے کر ایمان لائیں گے وہ اس کی ناقص و ناتمام پیروی کریں گے۔ (باقی)

اعلان

ہماری کتابیں تفہیمات اور سیاسی کشمکش حصہ سوم دیر سے ختم تھیں خدا کے فضل سے ہر دو کتابیں دوبارہ چھپ کر آگئی ہیں۔ ضرورت مند حضرات طلب فرما سکتے ہیں۔ جن حضرات کی فرمائشیں پہلے سے درج تھیں اُن کو یہ کتابیں روانہ کی جا رہی ہیں۔ قیمت تفہیمات دو روپے اور قیمت سیاسی کشمکش حصہ سوم عہر ہے

مینجر رسالہ ترجمان القرآن۔ دار الاسلام۔ پٹھان کوٹ

تفسیر سورۂ فاتحہ

از افادات مولانا حمید الدین فراہی

(۲)

دوسری فصل

۱- عملی اور قولی تواتر (مثلاً حدیث خداج اور حدیث قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی) سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ نماز کی سورت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو جو نماز سکھائی تھی، اس میں بھی قریب قریب یہی کلمات ہم کو ملتے ہیں۔ گو نصاریٰ نے اس کے بعض الفاظ اور بعض الفاظ کے مدلولات فراموش کر دیے جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے میثاق لیا پس انھوں نے بھلا دیا اس کا ایک حصہ جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی) ہم یہاں اس دعا کو نقل کرتے ہیں تاکہ فاتحہ کے ساتھ اس کی مطابقت اور پھر قرآن کی فضیلت نمایاں ہو سکے۔ لوقا باب ۱۱-۲ میں ہے

"پھر ایسا ہوا کہ وہ کسی جگہ دعا کر رہا تھا جب کہ چکا تو اس کے شاگردوں میں سے ایک نے اس سے کہا اے خداوند! جیسا یوحنا نے اپنے شاگردوں کو دعا کرنا سکھایا تو بھی ہمیں سکھا۔ اس نے ان سے کہا جب تم دعا کرو تو کہو اے ہمارے آسمانی باپ! تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی زمین میں بھی پوری ہو جس طرح آسمان میں پوری ہوتی ہے۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں روز دیا کر۔ اور ہمارے گناہ معاف کر کیونکہ ہم بھی اپنے ہر قرضدار کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ ہمیں شر سے نجات دے۔"

متی میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں:

"تیرے ہی لیے بادشاہی، قوت اور عظمت ہے ابد تک۔ آمین۔"

متی کے اکثر نسخوں میں یہ فقرہ نہیں تھا جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ بطور مقتدیوں کے جواب کے بڑھا دیا گیا ہے۔ اِن فقروں پر غور کرو گے تو فاتحہ کے ساتھ انکی مشابہت نہایت آسانی کے ساتھ واضح ہو جائے گی انجیل کے الفاظ "اے آسمانی باپ" "اے رب" کی خرابی ہیں۔ آل عمران، مائدہ، مریم اور زخرف وغیرہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ان لفظوں میں نقل ہوا ہے اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ (بے شک اللہ میرا رب اور تمہارا رب ہے پس اُسی کی بندگی کرو)

سبحٰنك (تیرا نام پاک مانا جائے) ہمارے "الحمد للہ" کی طرح ہے لیکن "سبحٰنک" صرف تعظیم و تنزیہہ ہے اور "الحمد" جیسا کہ واضح ہوگا تعظیم اور شکر دونوں پر مشتمل ہے"۔ تیری بادشاہی آئے، زمین میں بھی تیری مرضی پوری ہو جس طرح آسمان میں پوری ہوتی ہے"، مالک یوم الدین سے مشابہہ ہے۔ لیکن یہ روز جزا کی دعا ہے اور "مالک یوم الدین" اذعان و توکل کا کلمہ ہے۔ ہمارے ہاں روز جزا کے لیے دعا سے احتراز کیا گیا ہے کیونکہ سورۂ شوریٰ میں فرمایا گیا ہے يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ (اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ پر جو ایمان رکھتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ واقع ہو کے رہے گی) لیکن حضرت مسیح نے اس کے لیے دعا فرمائی اور ان کے لیے یہ دعا اس وجہ سے جائز ہوئی کہ وہ اپنے بعد ایک آسمانی بادشاہی کے ظہور کی بشارت دے رہے تھے اور یہ آسمانی بادشاہی روز جزا کے ظہور کے علاوہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر بھی مشتمل تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے بموجب دنیا کے لیے وہ شریعت فاصلہ نازل فرمائی جو ازل سے مقدر تھی۔ انجیل میں کتنی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ "آسمانی بادشاہی" سے مراد آنحضرت صلعم کی بعثت ہے۔ آیت وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ کے تحت ان شاء اللہ ہم اس کی پوری تفصیل کریں گے آنحضرت صلعم کی بعثت کے بعد آسمانی بادشاہی کا ایک جزء پورا ہو چکا تھا۔ اب صرف دوسرا جزء، روز جزا کا ظہور، باقی رہ گیا تھا اس لیے آنحضرت صلعم نے دعا نہیں فرمائی بلکہ حمد و اعتراف ربوبیت کے بعد توکل و رجاء کا اظہار کیا چنانچہ مشہور حدیث ہے کہ "نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے" یہاں تک فرمایا کہ "جب بندہ مالک یوم الدین کہتا ہے

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میرے بندے نے اپنے تئیں میرے حوالے کر دیا"۔ اور ظاہر ہے کہ اس امر میں تفویض ہی بہتر ہے۔
"ہماری روز کی روٹی ہمیں روز دیا کر" بھی محتاج تفصیل ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے
کہ وہ تمثیلوں میں باتیں کرتے ہیں۔ روٹی سے وہ "روح القدس" مراد لیتے تھے جس سے صلحا اور ابرار کی اصلی زندگی ہے۔
چنانچہ دعا کی تعلیم کے بعد اپنے عام طریقہ کے مطابق انھوں نے خود اس کی تفسیر بھی فرما دی "اگر تم برے ہو کر اپنے بچوں کو
اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو آسمانی باپ (پروردگار) اپنے مانگنے والوں کو روح القدس کیوں نہ دے گا"۔ دوسری
جگہ فرمایا "لکھا ہوا ہے (یعنی موسیٰ کے صحیفہ میں) کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی
کی طرف سے آتا ہے (یعنی اس کے امر و حکم سے زندگی پاتا ہے پس تمھاری زندگی اس کی شریعت کی پابندی میں ہے)۔
یہ حضرت عیسیٰ کے اسی قول کی طرف اشارہ ہے کہ "آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ جو کچھ خداوند کے منہ سے نکلتا ہے
اس سے جیتا ہے" پس "ہمیں روز کی روٹی روز دیا کر" کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں وہ چیز عنایت فرما جو ہماری ابدی زندگی
کا ذریعہ ہو یعنی وہ روحِ ہدایت جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے دعا کی شرح کرتے
ہوئے خود اس کی طرف اشارہ فرما دیا۔ متی میں ہے "تنگ دروازہ میں داخل ہو وہ دروازہ کشادہ اور وہ راستہ چوڑا ہے
جو موت کی طرف لے جاتا ہے اور اس میں داخل ہونے والے بہت ہیں اور وہ دروازہ بہت تنگ اور وہ راستہ بہت
پتلا ہے جو زندگی کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے چلنے والے بہت تھوڑے ہیں"۔ اس میں زندگی کے راستہ کی
مثال تنگ راستہ سے دی ہے اور یہی وہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) ہے جو بندے کو پروردگار کے پاس پہنچاتی
ہے اور وہی زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ زندگی دراصل یہ ہے کہ ہم اپنے پورے دل اور پوری جان سے اللہ تعالیٰ سے
محبت کریں اور وہ ہدایت جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں اسی زندگی کی طرف رہبری کرنے والا راستہ ہے قرآن
مجید میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارات ہیں۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي
النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا (کیا جو مردہ رہا ہو پھر ہم نے اس کو زندگی بخشی ہو اور
اس کو روشنی دی ہو جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہو اس کے مانند ہو گا جو تاریکیوں کے اندر ہو اور ان سے نکلنے والا نہ ہو)

اس آیت میں ایمان کو زندگی اور اتباعِ شریعت کو روشنی کے کرشمے سے تعبیہ کیا گیا ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم ملزوم ہیں، کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں، جیسا کہ فرمایا ہے وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس نے صراطِ مستقیم کی ہدایت پائی)۔

یہ انجیل کے فقرات کی شرح تھی جس کی تائید قرآن مجید کی اُن آیات سے ہوتی ہے جن میں جگہ جگہ حضرت عیسیٰ کے اقوال کی ترجمانی کی گئی ہے مثلاً اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے پس اسی کی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے) یعنی اللہ واحد کی بندگی جو اس کی بھیجی ہوئی شریعت کی اطاعت پر شامل ہے۔ پس حضرت مسیح کی دعا، ہماری دعا "اہدنا الصراط المستقیم" کے ہم معنی ہے اور ان کا قول "ہمارے گناہ معاف کر ہم بھی اپنے ہر قرضدار کو معاف کرتے ہیں" عفو کی التجا عمل عفو کے وسیلہ سے ہے۔ "ہم ایاک نعبد و ایاک نستعین" میں ہر اچھے کام کے کرنے اور ہر بُرے کام سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد چاہتے ہیں۔ ہم نے عفو اور اجر کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے دعا کے ادب کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ "ہماری مدد کر" اور نہ یہی کہا کہ "ہماری مدد کر کیونکہ ہم تیری مخلصانہ بندگی کرتے ہیں"۔ ہم نے وسیلہ کا ذکر کنایۃً کیا ہے یعنی یہ کہ ہم تیرے سوا کسی کو معبود نہیں بناتے۔ لیکن ہماری دعا دو وسیلوں پر مشتمل ہے کیونکہ "ایاک نستعین" خود بھی ایک وسیلہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے تیرے سوا کسی کو مستعان نہیں بنایا۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہی دو وسیلے سب سے بڑے وسیلے ہیں۔ تمام احکام میں سب سے بڑا حکم توحید ہے۔ حضرت عیسیٰ سے پوچھا گیا کہ "سب سے پہلا حکم کیا ہے"؟ انھوں نے فرمایا کہ "سن لے اسرائیل! اللہ ہمارا رب ایک ہے۔ اور یہ کہ تو اپنے خداوند سے محبت کر اپنے سارے دل، اپنی ساری جان، اپنی ساری عقل اور اپنی ساری قوت سے۔ یہ سب سے پہلا حکم ہے"۔ یعنی موسیٰ کی شریعت میں اسی طرح آیا ہے، اور توحید ہر نبی کی اولین تعلیم ہے۔ سورۂ ہود وغیرہ میں اس کے نہایت واضح شواہد موجود ہیں۔

"اور ہمیں آزمائش میں نہ لا اور شر سے بچا"۔ یعنی آزمائش کی لغزشوں سے بچا کہ جمنے کے بعد قدم اکھڑنے نہ پائیں۔ یہ دعا حضرت مسیح کے حسب حال ہے۔ انجیل میں آزمائش سے بچنے کی دعا بہت ہے۔ اور اس کی وجہ ان کی خشیت اور

آزمائشوں کی کثرت ہے لیکن آزمائش اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ کسی صورت میں اس سے مفر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (اس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں کس کا عمل بہترین ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ مجرد یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی جانچ نہیں ہوگی، حالانکہ ہم نے جانچا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گذرے) اس کے علاوہ بہت سے انبیاء کی آزمائشیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہے وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (جبکہ ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو اس نے پوری کردیں فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا) اسی طرح آدم علیہ السلام کو جنت کے درخت اور نوح علیہ السلام کو ان کے بیٹے کے بارے میں آزمایا اور فرمایا اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے مت بنو) چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے توبہ و استغفار کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت ہے وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ (اور داؤد نے گمان کیا کہ ہم نے اس کو آزمایا پس اس نے اپنے رب سے مغفرت مانگی) اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت ہے وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ڈال دیا اس کے تخت پر ایک دھڑ پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا) حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا ابتلاء یہود کے صحیفوں میں مذکور ہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے یردن کے اُسی پار انتقال کیا اور ارض موعود تک قوم کی رہبری نہ کرسکے۔ حضرت مسیح کے ابتلاء کی تفصیل آگے آئے گی۔ حضرت یوسفؑ کی سرگذشتِ امتحان معلوم ہے۔ حضرت ایوبؑ کے شکوے سفر ایوب میں دیکھو۔ حضرت یحییٰؑ کی آزمائش قتل سے ہوئی۔ یہ باتیں سب کو معلوم ہیں۔ جو نہیں معلوم ہیں ان کو اسی عام اور ہمہ گیر کلیہ سے سمجھ لینا چاہیے جو خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اور اس مضمون کی دوسری آیات میں بیان ہوا ہے۔

ان باتوں کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی خشیت کی شدت اور اپنی امت کی کمزوری

کی وجہ سے برابر آزمائش سے پناہ مانگتے رہے۔ ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چالیس دن تک سخت آزمائش ہوئی اور ویسے تو ان کی ساری زندگی آزمائشوں کا ایک سلسلہ ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھایا اور زمین کے فتنوں سے نجات بخشی جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے اِنِّیْ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (میں تم کو اپنی طرف اٹھانے والا اور کافروں سے نجات دینے والا ہوں) اسی طرح ان کی امت کو بھی اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا اور جو ان میں اہل ایمان تھے ان کو راہِ حق پر ثابت قدم رکھا۔ سورۂ بروج میں اس کے اشارات موجود ہیں اور تاریخ تو ان کی آزمائش واستقامت کے واقعات سے معمور ہے۔ (دعا کے اس فقرہ کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس ہولناک فتنہ کو دیکھ لیا تھا جو آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے منہ کھولے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی پوری تفصیل سامنے لانے کے لیے اُن واقعات کو یاد کرنا چاہیے جو آپ کی امت کو پیش آئے اور جن کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ حضرت نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سوا ان کی نجات کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہ گئی)

اور یہ جو حضرت مسیح نے فرمایا کہ "ہمیں شر سے نجات دے" تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی اور جس طریقہ سے انھوں نے مانگی تھی اس سے بہتر طریقہ پر نجات دی لیکن اس امر کو یاد رکھنا چاہیے کہ طلب نجات کے ساتھ ساتھ وہ مرضیِ الٰہی پر بھی راضی تھے جو اصل دولتِ جاودانی ہے۔ انجیل کا وہ منظر میری چشمِ تصور کے سامنے ہے جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام کوہِ زیتون پر مقامِ جسمین میں حواریوں سے بالکل الگ تھلگ اللہ کے حضور گریہ وزاری کر رہے ہیں اور یہ دعا کر رہے ہیں کہ "اے خداوند! یہ پیالہ مجھ سے ہٹالے، تو ہر بات پر قادر ہے لیکن میں اپنی مرضی پر تیری مرضی کو ترجیح دیتا ہوں بس تیری ہی مرضی پوری ہو" آپ نے اپنے حواریوں کو بھی حکم دیا کہ دعا میں شریک ہوں لیکن وہ سو گئے۔ آپ بار بار ان کے پاس آتے اور پلٹ کے پھر جاتے اور دعا و مناجات میں سرگرم ہوتے۔ وہ ساعت بھی نگاہِ تخیل کے سامنے ہے جب تمام اسباب و وسائل کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور آپ پکار اٹھتے ہیں "خداوندا خداوندا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا"۔ وہ وقت بھی قابلِ لحاظ ہے جبکہ موت کا پیالہ ان کے ہونٹوں سے لگ جاتا ہے لیکن

اللہ تعالیٰ اس کو مٹادیتا ہے اور ان کو اٹھا کر کافروں کو نجات بخشتا ہے۔ اسی طرح ان کی امت کے اُن اہل ایمان کو بھی اللہ تعالیٰ نے نجات دی جو نبی امی صلعم پر ایمان لائے جس کی انھوں نے خوشخبری دی تھی اور آئندہ بھی جو ایمان لائیں گے وہ نجات پائیں گے۔ پس امت کے مخلصین کے بارے میں آپ کی دعا قبول ہوئی۔ وہ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اور آئندہ داخل ہوتے رہیں گے۔ لیکن ظالموں کے باب میں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نہیں قبول ہوئی اُسی طرح آپ کی دعا بھی نہیں قبول ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس کا جواب قرآن مجید میں یوں مذکور ہے قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (پوچھا اور میری اولاد میں سے ؟ فرمایا میرا عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہیں) یہ تفصیل ہوئی ان کی دعا کے اس فقرہ کی کہ "ہم کو فتنہ میں نہ ڈال اور شر سے نجات دے"۔

اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ فقرہ توضیح مزید ہے اس فقرہ کی کہ "ہمیں روز کی روٹی دیا کر"۔ کیونکہ روٹی سے مراد جیسا کہ بیان ہوا، روح قدس اور روح ہدایت ہے۔ تو جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اس کو لاریب فتنہ اور ہر قسم کے روحانی شر سے نجات بخشی۔ پس یہ اصل ہدایت کی دعا ہے۔ پھر بعد کی تفسیر سے انھوں نے یہ بات واضح فرما دی کہ اس زندگی کا دروازہ تنگ اور اس کا راستہ تنگ ہے، جس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ اس سے مراد وہ ہدایت الٰہی ہے جس کو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا دراصل شریعت کے اہتمام اور اس فتنہ ضلالت کے سدباب کے لیے تھی جس کا آپ کو اپنی امت کے متعلق اندیشہ تھا اور جس کی ایک عبرت انگیز مثال یہود کی زندگی میں موجود تھی کہ خود مسیح علیہ السلام کی نبوت ان کے قبول حق کی راہ میں ایک پتھر بن گئی جیسا کہ انجیل میں اس کی تصریح ہے اور خود قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَلَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۔ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ (مائدہ) (اور ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے،

جب جب آیا ان کے پاس کوئی رسول ایسی باتیں لے کر جو ان کی خواہشوں (بدعات) سے میل نہ کھاتیں تو ایک گروہ کا انھوں نے انکار کر دیا اور ایک جماعت کو وہ قتل کرتے رہے اور انھوں نے گمان کیا کہ کوئی فتنہ نہ ہوگا پس اندھے بہرے بن گئے، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی پھر اندھے بہرے بن گئے ان میں سے بہتیرے۔

ٹھیک اسی طرح ہمارے ہاں سورۂ فاتحہ میں "صراط الذین انعمت علیہم" کے الفاظ اس طریق ہدایت کی توضیح کر رہے ہیں جس کا ذکر اوپر "اہدنا الصراط المستقیم" میں گذر چکا ہے اور یہ غایت درجہ اہتمام ہے اس ہدایت کے لیے جس میں ایک امت بھٹک چکی ہے اور ایک خدا کے قہر و غضب کی مستحق ٹھیر چکی ہے اور چونکہ قرآن مجید ایک واضح ترین کتاب ہے اس لیے اس اجمال کی بھی اس نے ایسی وضاحت فرما دی ہے کہ جس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بےجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-